۴ اہل تأویل کے چند شبہات اوران کا ازالہ

بعض اہل تأویل نے أہل السنۃ پر ایک اعتراض وارد کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات پر مشتمل، قرآن وحدیث کے بعض نصوص کو تم نے بھی ان کے ظاہری معنی سے پھیرا ہے اور یوں تاویل کا ارتکاب کیا ہے، جس کا معنی یہ ہوا کہ اہل السنۃ خود قرآن وحدیث کے نصوص میں تاویل کے مرتکب ہوئے ہیں یا کم از کم مداھنت کا پہلو ضرور اختیار کیا ہے، تو پھر ہمارے تاویل روا رکھنے کا انکار کیوں؟ جبکہ خود بعض مواقع پر اس فعل کا سہارا لیا ہے؟

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم اہل تأویل کے اس اعتراض، جو درحقیقت شبہ ہی قرار پائے گا کے دو جواب دیتے ہیں، ایک مجمل، دوسرا مفصل

مجمل جواب: مجمل جواب مختصراً دو نکات میں منحصر ہے۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ جن نصوص کے بارہ میں تم اہل السنۃ کو تأویل کے مرتکب ہونے کا الزام دیتے ہو ہم ان کے بارہ میں قطعاً تسلیم نہیں کرتے کہ اہل السنۃ نے ان کے معنیٰ ظاہر کو پھیرا یا بدلا ہے؛ کیونکہ کسی بھی لفظ یا جملے کا جو معنیٰ مشہور ہوتا ہے وہی ظاہری معنی بنتا ہے، اور یہ معنی، کلام کے ظاہری سیاق وسباق کے اختلاف سے مختلف ہوسکتا ہے، بعض اوقات ترکیب کلام کی مناسبت سے ایک لفظ کا معنی بدل جاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ کلام لفظوں اور جملوں سے ہی ملکر بنتا ہے، لہذا ان لفظوں اور جملوں کے معنی کا تعین تب ہی ممکن ہے جب وہ آپس میں مل کر کلام کی شکل اختیار کریں گے (لہذا اگر ایک لفظ کا معنی، کہیں کچھ ہو اور کہیں کچھ ہو تو اس اختلاف کو معنیٰ ظاہر سے انحراف قرار نہیں دیا جائے گا، بلکہ ترکیبِ کلام اور سیاقِ کلام کی مناسبت سے جہاں جو معنی بنے گا وہاں وہی معنی، معنیٰ ظاہر ہوگا)

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر اہل السنۃ کی قرآن وحدیث کی کسی نص کی کسی تفسیر کو ظاہری معنی سے عدول تسلیم بھی کرلیا جائے تو ان کا یہ عدول قرآن وحدیث کی دلیل کی بناء پر ہوتا ہے، خواہ وہ

عدول وہیں مذکور ہو یا کسی دوسرے مقام پر۔(گویا اہل السنۃ کا کسی مقام پر معنیٰ ظاہر سے صرفِ نظر، قرآن وحدیث کی دلیل کی بناء پر ہے، جبکہ اہل تأویل کا نصوصِ قرآن وحدیث میں معنیٰ ظاہر سے انحراف ذاتی شبہات کی بناء پر ہے)

ذاتی شبہ تو کوئی دلیل نہیں، مگر اہل تأویل اپنے ذاتی شبہات کو براھینِ قطعیہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان کردہ وثابت کردہ صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی کر بیٹھے ہیں (والعیاذ باللہ)

مفصل جواب: مفصل جواب کیلئے ہم ان تمام نصوص کا جائزہ لیتے ہیں جن کے بارہ میں اہل تأویل کا دعویٰ ہے کہ سلفِ صالحین نے ان میں ظاہری معنی سے روگردانی کی ہے، اس سلسلہ میں کچھ مثالیں (بمعہ تبصرہ وجواب) پیشِ خدمت ہیں۔

امام غزالی نے بعض حنابلہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل صرف تین احادیث میں تأویل کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ایک ''حجر اسود زمین میں اللہ کا دایاں ہاتھ ہے''۔

دوسری، ''تمام بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے بیچ میں ہیں''۔

تیسری، ''میں رحمٰن کا نفس، یمن کی طرف سے پاتا ہوں''۔(الاحیاء ۱/۱۷۹)

اس کلام کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ (ص:۳۹۸) میں نقل فرمایا ہے، اور کہا ہے کہ: یہ حکایت امام احمد بن حنبل پر کذب وافتراء ہے۔

ہم ان تینوں مثالوں پر تفصیلی کلام کرتے ہیں

پہلی مثال: [الحجر الأسود یمین اللہ فی الارض]

یعنی حجر اسود زمین پر اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، اور نبی ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔

امام ابن الجوزی " العلل المتناهیه " میں فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

حافظ ابن العربی فرماتے ہیں: یہ حدیث باطل اور نا قابلِ التفات ہے۔

ابن تیمیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث نبی ﷺ سے ایک ایسی سند سے مروی ہے جو ثابت نہیں۔ [1]

جب یہ حدیث باطل ٹھہری تو پھر اس کے معنی میں غور وخوض کی کوئی ضرورت نہ رہی، تاہم شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس بارہ میں مشہور بات عبداللہ بن عباس سے مروی ایک اثر ہے، وہ فرماتے ہیں:

" حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ ہے جس نے اس سے مصافحہ کیا یا بوسہ دیا اس نے گویا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا، اور اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دیا " [2]

اس عبارت پر غور کرنے والے ہر شخص پر یہ بات واضح اور عیاں ہوگی کہ اس میں کسی قسم کا کوئی اشکال نہیں ہے، کیونکہ عبداللہ بن عباس نے حجر اسود کو مطلقاً اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ قرار نہیں دیا، بلکہ زمین میں اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ کہا ہے اور ظاہر ہے کہ لفظِ مقید کا حکم لفظ مطلق سے مختلف ہوتا ہے۔

پھر یہ فرمایا کہ اس سے مصافحہ کرنے والا، یا بوسہ دینے والا گویا اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کر رہا ہے یا اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دے رہا ہے...... جملے کی اس ساخت سے بصراحت واضح ہو رہا ہے کہ حجر اسود سے مصافحہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے دائیں ہاتھ سے قطعاً مصافحہ نہیں کر رہا، بلکہ حجر اسود سے مصافحہ کرنے والے کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کر رہا ہے، چنانچہ حدیث کے پہلے اور آخری حصہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ حجر اسود اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے، جیسا کہ ہر عقلمند اس بات سے واقف ہے۔ (مجموع الفتاویٰ ج٦ ص٣٩٨)

---

[1] شیخ البانی نے بھی اس حدیث کو الضعیفۃ (١/٢٥٧) میں ضعیف قرار دیا ہے۔

[2] غريب الحديث لابن قتيبة (٢/٩٦) تاريخ مكة للأزرقي (١/٣٢٤)

دوسری مثال:[قلوب العباد بین الاصبعین من اصابع الرحمن]

یعنی (تمام بندوں کے دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے درمیان ہیں)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور صحیح مسلم کتاب القدر کے دوسرے باب میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی روایت سے مذکور ہے، انہوں نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[ان قلوب بنی آدم کلھا بین اصبعین من اصابع الرحمن کقلب واحد یصرفه حیث یشاء]ثم قال رسول الله ﷺ [اللھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک]

یعنی (تمام اولادِ آدم کے دل، قلبِ واحد کی طرح رحمٰن کی انگلیوں میں سے دوانگلیوں کے بیچ میں ہیں، وہ انہیں جس طرح چاہے پھیر دے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا فرمائی اے اللہ دلوں کے پھیرنے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے)

سلفِ صالحین اہل السنۃ نے اس حدیث میں کوئی تاویل نہیں کی، بلکہ اس کے ظاہری معنیٰ ہی کو لیا ہے، اللہ تعالیٰ کی حقیقی انگلیاں ہیں ہم انہیں اللہ تعالیٰ کیلئے اسی طرح ثابت کرتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے ثابت فرمائیں۔ بندوں کے دلوں کا اللہ تعالیٰ کی دوانگلیوں کے بیچ میں موجود ہونے کا یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ انگلیاں دلوں کو مس کر رہی ہیں، کیونکہ اس سے حلول کا وہم پیدا ہوتا ہے، لہذا یہاں اس جملہ کو معنی ظاہر سے پھیرنا پڑے گا (کیونکہ قرینہ موجود ہے) جیسے بادل زمین وآسمان کے بیچ موجود ہیں، لیکن نہ وہ آسمان کو مس کر رہے ہیں نہ زمین کو چھو رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے "بدر بین مکة والمدینة" یعنی چاند مکہ اور مدینہ کے بیچ میں ہے، حالانکہ چاند، مکہ اور مدینہ میں سے کسی سے مس نہیں کر رہا ہے، بلکہ مکہ، مدینہ اور چاند کے درمیان کس قدر دوری موجود ہے۔ لہذا بندوں کے دلوں کا اللہ تعالیٰ کی انگلیوں کے بیچ میں ہونا حقیقۃً ثابت

ہے،لیکن اس سے نہ تو مس کرنالازم آرہاہے نہ حلول۔

تیسری مثال:[انی اجد نفس الرحمن من قبل الیمن](الحدیث)

یعنی (میں رحمٰن کا نفَس یمن کی طرف سے پا تا ہوں)

(یہاں شبہ یہ ہے کہ نفَس کا معنیٰ ظاہر سانس ہے،لیکن یہ معنی مراد نہیں لیا گیا،جس سے ثابت ہوا کہ اہل السنۃ نصوصِ صفات میں تاویل کے مرتکب ہوئے ہیں)

جواب یہ ہے کہ یہ حدیث مسند احمد میں بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ موجود ہے،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[ألا ان الایمان یمان والحمکة یمانیة وأجد نفَس ربکم من قبل الیمن]یعنی:(ایمان تو یمنی ہےاور حکمت بھی،اور میں تمہارے پروردگار کے نفَس کو یمن کی طرف سے پاتا ہوں)(مسند احمد (۵۹/۲)

''مجمع الزوائد'' میں ہے کہ اس حدیث کے تمام راوی (شبیب کے علاوہ) صحیح بخاری کے ہیں، شبیب صحیح بخاری کا راوی نہیں ہے لیکن وہ ثقہ ہے۔تقریب التھذیب میں شبیب کو ثقہ اور طبقہ ثالثہ کا راوی قرار دیا گیا ہے۔اس جیسی ایک روایت امام بخاری رحمہ اللہ نے ''التاریخ الکبیر'' میں بھی روایت فرمائی ہے۔

اس حدیث میں اہل السنۃ نے کوئی تاویل نہیں کی، بلکہ معنیٰ ظاہر ہی مراد لیا ہے، چنانچہ ''نَفَس '' (بفتح الفاء) بابِ تفعیل '' نفَّس ینفس تنفیسا ونَفَسًا '' سے مصدرِ ثانی ہے اس کے وزن پر دوسری مثال ''فَرَّجَ یفرج تفریجا وفَرَجاً '' دی جاسکتی ہے۔النھایۃ ،القاموس اور مقاییس اللغہ میں علماءِ لغت نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔مقاییس اللغہ میں ہے ''نَفَسَ سے مراد مکروب یعنی کرب زدہ شخص کے کرب کو دور کرنا ہے۔''

اب حدیث کا معنی یوں ہوگا اللہ تعالیٰ کا مؤمنین کی تکالیف ومصائب کا دور کرنا یمن کی طرف سے ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اہلِ یمن ہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے مرتدین سے جنگیں لڑیں اور بہت سے علاقوں کو فتح کیا، لہٰذا ان کے ذریعہ رحمٰن نے مؤمنین کی مدد فرمائی اور ان کی تکالیف کا ازالہ فرمایا'' (مجموع الفتاویٰ ۶/۳۹۸)

(تو گویا نَفَس کا مذکورۃ الصدر معنی، معنی ظاہر ہی ہے اور یہاں کسی قسم کی کوئی تاویل نہیں کی گئی)

چوتھی مثال: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ...... الایۃ﴾ (البقرۃ:۲۹)

جواب: اس آیتِ کریمہ کی تفسیر میں اہل السنۃ کے دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ یہاں ''استویٰ الی السماء'' بمعنی ''ارتفع الی السماء'' ہے (مراد آسمان کی طرف چڑھنا اور بلند ہونا) معروف مفسر ابنِ جریر نے اسی معنی کو راجح قرار دیا ہے، چنانچہ اپنی تفسیر میں استواء الی السماء کے معنی کے بارے میں علماء کا اختلاف نقل کرکے فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ'' کا معنی یہ ہے کہ ''پھر وہ آسمانوں پر چڑھا اور بلند ہوا اور اپنی قدرت سے تدبیر فرمائی، اور انہیں سات کی تعداد میں پیدا فرمایا'' امام بغوی نے اپنی تفسیر میں اس معنی کو عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اکثر مفسرین کا قول قرار دیا ہے۔

اب یہاں ''استواء الی السماء'' کا معنی ظاہر یعنی ''ارتفاع الی السماء'' مراد لیا گیا، اور ''ارتفاع الی السماء'' کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا گیا، (یعنی فحوائے آیتِ کریمہ ''ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ'' اس کا آسمان کی طرف چڑھنا ثابت اور برحق ہے، لیکن چڑھنے کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں، جسے اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا ضروری ہے)

''استویٰ الی السماء'' کا دوسرا معنی قصدِ تام ہے۔ یعنی ''پھر اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی طرف قصد فرمایا......''

امام ابنِ کثیر نے سورۃ البقرۃ اور امام بغوی نے سورۂ فصلت کی تفسیر میں اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ'' کا معنی یہ ہے کہ

پھراس نے آسمانوں کی طرف قصد فرمایا۔ یہاں "استواء" قصد کرنے اور متوجہ ہونے کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ "الی" کے ساتھ متعدی ہے۔"

امام بغوی نے بھی "ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَاءِ" کا معنیٰ "عمد الی خلق السماء" کیا ہے، یعنی اس نے آسمانوں کو خلق فرمانے کا قصد فرمایا۔

واضح ہو کہ یہاں "استواء" بمعنیٰ "قصد" کی تفسیر کلام کو معنیٰ ظاہر سے پھیرنا قرار نہیں دی جاسکتی، کیونکہ فعل "استویٰ" حرف "الی" سے ملا ہوا ہے اور حرفِ "الی" غایت اور انتہاء پر دلالت کرتا ہے، جس کی وجہ سے یہ فعل (استویٰ) ایک ایسے معنی کی طرف منتقل ہو گیا جو حرفِ مقترن یعنیٰ "الی" کے بالکل مناسب ہے۔

اس کی ایک اور مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ﴾ (الدھر:٦)

ترجمہ: (چشمہ، جس سے اللہ کے بندے سیراب ہونگے)

اب "یشرب" کا اصل معنی پینا ہے لیکن یہاں سیراب ہونا مراد ہے، (یعنی یشرب بمعنیٰ یروی) کیونکہ فعلِ "یشرب" حرفِ باء کے ساتھ ملکر آیا ہے لہذا بمعنیٰ "یروی" کی طرف منتقل ہو گیا جو "باء" کے مناسب ہے۔

ثابت ہوا کہ بعض اوقات فعل اپنے متعلقہ حرف کی وجہ سے اپنے اصل معنی سے معنیٰ دیگر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، تاکہ کلام میں حرف کے معنی کی مناسبت پیدا ہو جائے۔ (خلاصہ یہ ہے کہ استواء کا مذکورہ معنی، متعلقہ حرف "الی" کی مناسبت سے ہے، لہذا یہ معنیٰ ظاہر سے عدول قرار نہیں پائے گا۔

پانچویں اور چھٹی مثال: اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید میں فرمایا

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ﴾ (الحدید:٤)

ترجمہ: (اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

سورۃ المجادلۃ میں فرمایا: ﴿وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَا کَانُوْا﴾

ترجمہ: (اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے وہ جہاں بھی ہوں)

جواب یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کی اہل السنۃ نے جو تفسیر کی ہے وہ حقیقت اور معنیٰ ظاہر پر قائم ہے۔ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت (مخلوق کے ساتھ ہونا) کی حقیقت اور ظاہر کیا ہے؟ کیا صفتِ معیت یعنی مخلوق کے ساتھ ہونے کی حقیقت اور ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہے اور ان کی جگہوں اور چیزوں میں حلول کیئے ہوئے ہے؟ یا اس صفتِ معیت کی حقیقت اور ظاہر اس بات کو متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بذاتہ تو تمام مخلوقات کے اوپر، عرشِ معلیٰ پر مستوی ہے، لیکن اپنے علم، قدرت، سمع، بصر، تدبیر، اور بادشاہت وغیرہ کے ساتھ پوری مخلوق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

پہلا قول ظاہر البطلان ہے، آیات کا سیاق اس مفہوم کا ہرگز متقاضی نہیں ہے، نہ ہی کسی صورت اس پر دلالت کررہا ہے، کیونکہ یہاں صفتِ معیت (ساتھ ہونا) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے کہیں بڑی ہے کہ کوئی مخلوق اس کا احاطہ کرلے۔ پھر وہ لغتِ عرب جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اس میں معیت اختلاط کو مستلزم نہیں ہے، نہ ہی کسی مقام پر بذاتہ موجود ہونا ضروری ہے بلکہ مطلقاً مصاحبت کے معنی پر دال ہے۔ (مصاحبت کی کوئی بھی صورت ہو) اب صفتِ معیت کی ہر مقام پر وہی تفسیر کی جائے گی جو مطابقِ سیاق اور مناسبِ مقام ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کو اختلاط اور حلول کے معنی میں لینا کئی وجوہ سے باطل ہے:

(۱) یہ معنی سلفِ صالحین کے اجماع کے خلاف ہے۔ اولاً: علماءِ سلف میں سے کسی نے بھی یہ معنی نہیں کیا۔ ثانیاً: اللہ تعالیٰ کے خلق میں اختلاط وحلول کے انکار پر سب کا اجماع ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا مخلوق میں اختلاط وحلول، اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کے منافی ہے، حالانکہ اس

ذات کا علو کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف سے ثابت ہے۔

اب جو صفت اتنے ٹھوس دلائل سے ثابت ہے اس کے منافی ومخالف ہر معنی باطل ہوگا، اور یہ بطلان ان تمام دلائل سے ثابت ہوگا جن سے اس کے منافی صفت ثابت ہورہی ہے، تو چونکہ اللہ تعالیٰ کا علو کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف تمام دلائل سے ثابت ہے، لہذا اس کا اختلاط وحلول فی الخلق، کتاب، سنت، عقل، فطرت اور اجماعِ سلف تمام دلائل سے باطل ہوگا۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اختلاط وحلول کو مان لیں تو اس سے بہت سے ایسے امور لازم آتے ہیں جو باطل ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہیں۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی کما حقہ قدر بھی جانتا اور کرتا ہو، نیز اسے کلامِ عرب، کہ جس میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا، میں معیت کا معنی ومدلول بھی معلوم ہو، تو اس کیلئے یہ بات ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کی حقیقت یہ بتائے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے اندر موجود ومختلط ہے یا ان کے اماکن ومقامات میں حلول کیئے ہوئے ہے، وہ تو یہ بھی نہیں کہے گا کہ اس کی صفت معیت کا تقاضہ، اختلاط فی الخلق ہے چہ جائیکہ کہ صفتِ معیت کے اختلاط فی الخلق کے مستلزم ہونے کا عقیدہ رکھے، یہ تو ربِّ جلّ وعلا کی عظمت سے جاہل ونا آشنا شخص ہی کا عقیدہ ہوسکتا ہے۔

جب اس قول کا بطلان واضح ہوگیا تو پھر یہ حقیقت متعین ہوجائے گی کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے معنی کے سلسلہ میں دوسرا قول حق ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ باعتبارِ علم، قدرت، سمع، بصر، تدبیر، بادشاہت اور شانِ ربوبیت کی دیگر متقاضیات کے ساتھ پوری خلق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، جبکہ اس کی ذاتِ اقدس پوری خلق کے اوپر عرش پر مستوی ہے۔

اس تقریر سے یہ ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت پر مشتمل مذکورہ دونوں آیات کا بلاشبہ

یہی معنیٰ ظاہر ہے، کیونکہ یہ دونوں آیات حق ہیں اور حق کا معنیٰ ظاہر حق ہی ہوتا ہے، جبکہ قرآنِ مجید جو کتابِ حق ہے کے کسی لفظ کا معنی، معنیٰ باطل نہیں ہوسکتا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتویٰ الحمویہ (۱۰۳/۵) میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی معیت کے باعتبارِ مقام وسیاقِ آیات، مختلف معانی واحکام ہیں، مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَايَخْرُجُ مِنْهَا وَمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَايَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت مذکور ہے اور سیاقِ آیت اور مناسبتِ مقام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں معیت کا معنی، حکم یا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر پوری پوری طرح مطلع، باخبر اور گواہ ہے، تمہارے تمام امور جانتا ہے اور تمہارا پوری طرح احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں سلفِ صالحین کے قول "انه معهم بعلمه" کا یہی معنی ومراد ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں معیت کا یہی معنی، معنیٰ ظاہر وحقیقی قرار دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مندرجہ ذیل فرمان میں بھی سیاقِ آیت معیت کے اسی معنی پر دلالت کر رہا ہے:

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلاثَةٍ اِلَّاهُوَ رَابِعُهُمْ وَلَاخَمْسَةٍ اِلَّا هُوَسَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَااَكْثَرَ اِلَّاهُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَاكَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَاعَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (المجادلۃ:۷)

ترجمہ: (تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا

وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

اب صفتِ معیت کے سلسلہ میں قرآنِ مجید کا ایک اور مقام ملاحظہ فرمایئے، ہجرت کے موقعہ پر غارِ ثور میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے رفیقِ سفر ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

﴿ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ﴾ (یعنی غم نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے)

یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا ذکر ہے اور سیاقِ مقام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں معیت سے مراد، اللہ تعالیٰ کے باخبر ہونے کے ساتھ ساتھ نصرت اور تائید فرمانے کے بھی ہے۔

چونکہ سیاقِ آیت سے یہی معنی ثابت ہو رہا ہے لہذا یہاں یہی معنی، معنیٰ ظاہر وحق ہے۔

شیخ الاسلام مزید فرماتے ہیں:

لفظِ معیت، قرآن وحدیث میں مختلف مقامات پر وارد ہوا ہے اور ہر مقام پر اس کا معنی و مقتضیٰ دوسرے مقام سے باعتبارِ سیاق مخالف ہوسکتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ لفظِ معیت کا استعمال جہاں جہاں ہوا ہے اگر ان تمام مقامات پر غور کریں تو معنوی اعتبار سے کوئی قدرِ مشترک ہو، لیکن ہر مقام پر باعتبارِ سیاق کوئی ایسی خاصیت ہو جو ایک جگہ کے معنی کو دوسری جگہ کے معنی سے ممتاز کردے۔

بہر حال دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، خلق میں مختلط نہیں ہے، اور یہ نتیجہ معنیٰ ظاہر سے ہرگز عدول نہیں ہے، کما تقدم۔

اس حقیقت کو مزید سمجھنے کیلئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ اپنی خلق کے ساتھ مختلط ہے اور بذاتہ ان کے درمیان موجود ہے، سورۃ المجادلۃ کی اس آیت پر کہ جس میں صفتِ معیت کا ذکر ہے دوبارہ غور کیجئے:

﴿اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلَاثَۃٍ

اِلَّاهُوَ رَابِعُهُمْ وَلَاخَمْسَةٍ اِلَّا هُوَسَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَااَکْثَرَ اِلَّاهُوَ مَعَهُمْ اَیْنَ مَاکَانُوْا ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَاعَمِلُوْا یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٍ﴾(المجادلۃ:۷)

ترجمہ: (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کی اورزمین کی ہر چیز سے واقف ہے، تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہے اور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں، پھر قیامت کے دن انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ معیت کا جب ذکر فرمایا تو آیت کے اول وآخر میں عمومِ علم کا تذکرہ فرمایا، چنانچہ آیتِ کریمہ کی ابتداء میں ﴿اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوَاتِ وَمَافِی الْاَرْضِ ......﴾ بیان فرمایا اور آخر میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٍ﴾ بیان فرمایا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بندوں کے ساتھ معیت کا معنی یہ نہیں کہ وہ بندوں میں مختلط ہے یا زمین پر انکے ساتھ اور انکے درمیان موجود ہے، بلکہ یہ معنی ہے کہ وہ بندوں کے تمام امور کا باعتبارِ علم احاطہ کیئے ہوئے ہے اور کسی بندے کا کوئی عمل اس سے مخفی نہیں ہے۔

اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت جس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کا ذکر ہے کے مکمل سیاق پر غور کیجئے:

﴿هُوَالَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ فِی سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْهَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَکُمْ أَیْنَ مَاکُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾(الحدید:۴)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر مستوی ہوگیا، وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو

کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور جو تم کر رہے ہو اللہ دیکھ رہا ہے)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ معیت کے ذکر سے قبل اپنے مستوی علی العرش ہونے کا ذکر فرمایا، نیز عمومِ علم کا بھی تذکرہ فرمادیا۔اور آیت کے آخر میں یہ حقیقت بھی صراحتاً بیان فرمادی کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اب اس آیت کا معنیٰ ظاہر وحق کھل کر اور نکھر کر سامنے آگیا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے بندوں کا پورا علم ہے اور وہ ان کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذات مخلوقات میں سب سے بلند اپنے عرش پر مستوی ہے، لہذا نہ تو وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہے اور نہ ہی زمین کے اوپر ان کے درمیان موجود ہے۔ورنہ یہ لازم آئے گا کہ یہ آیتِ کریمہ آپس میں بُری طرح متضاد ومتناقض ہے، چنانچہ شروع کا حصہ اللہ تعالیٰ کے ''علو'' اور ''استواء علی العرش'' کا اعلان کر رہا ہے اور نعوذ باللہ آخری حصہ زمین پر موجود ہونے اور خلق کے ساتھ مختلط ہونے کا تذکرہ کر رہا ہے۔(تعالیٰ اللہ عن ذلک علوا کبیرا)

بہرحال ہماری اس تقریر وتوضیح سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ ہونے کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ ان کے تمام احوال سے باخبر ہے، ان کی ہر بات سنتا اور ہر فعل دیکھتا ہے، ان کے امور وحاجات کی تدبیر فرماتا ہے، زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، مالدار اور فقیر کرتا ہے، جس کو چاہے بادشاہت دے دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے، جسے چاہے عزت اور جسے چاہے ذلت عطا فرمادیتا ہے اور اسکے علاوہ وہ تمام امور انجام دیتا ہے جن کا اس کی شانِ ربوبیت وکمالِ بادشاہت تقاضہ کرتی ہے۔اس کے اور اس کی خلق کے درمیان کوئی چیز حائل یا حاجب نہیں ہے۔جس کے علم واحاطہ وقدرت کی یہ شان ہو تو وہ حقیقۃً خلق کے ساتھ ساتھ ہے اگرچہ وہ حقیقت میں سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے العقیدۃ الواسطیۃ (۱۴۲/۳)
میں صفتِ معیت پر کلام کیلئے ایک الگ فصل قائم کر کے فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کا یہ تمام کلام کہ وہ اپنے عرش پر ہے اور وہ ہمارے ساتھ ہے، حق ہے اور اپنی حقیقت پر قائم ہے، کسی تحریف کا محتاج نہیں ہے، البتہ اسے جھوٹے اور باطل افکار وظنون سے بچانا ضروری ہے (تا کہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو جائے)

مزید الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۲/۵ ، ۱۰۳) میں فرماتے ہیں:

'' حاصلِ امر یہ ہے کہ کتاب وسنت سے مکمل ہدایت ونور حاصل ہوتے ہیں، بشرطیکہ انسان صرف کتاب وسنت ہی پر تدبر کرے، صرف اتباعِ حق اس کا مقصود ہو، نصوصِ کتاب وسنت میں ہر قسم کی تحریف ،اور اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں ہر قسم کے الحاد کے ارتکاب سے اعراض واجتناب کرنے والا ہو۔

کوئی بھی شخص یہ سمجھنے کی کوشش وجسارت نہ کرے کہ اللہ تعالیٰ کی وحی (کتاب وسنت) میں آپس میں تناقض پایا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں وہ یہ مثال پیش کرے کہ کتاب وسنت میں یہ بات وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عرش پر مستوی ہے، یہ بات ظاہراً اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مخالف ومتعارض ہے: ﴿وھو معکم﴾ یعنی (وہ تمہارے ساتھ ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کے خلاف ہے: [اذا قام أحد کم فی الصلوۃ فان اللہ قِبَل وجھہ] یعنی (جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے)

واضح ہو کہ ان نصوص میں دعویٔ تعارض باطل ومردود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونا بھی محمول برحقیقت ہے، اور اس ذاتِ وحدہ لاشریک کا مستوی علی العرش ہونا بھی محمول برحقیقت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانِ درج ذیل میں دونوں باتوں کو یکجا ذکر فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْهَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَاکُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہی ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھرعرش پر مستوی ہوگیا، وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جوزمین میں جائے اور جواس سے نکلےاور جوآسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کراس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہووہ تمہارے ساتھ ہے اور جوتم کررہے ہواللہ دیکھ رہاہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبردی ہے کہ وہ اپنے عرش کےاوپر ہے، کائنات کی ہرچیز کوجانتا ہے، اور ہم جہاں بھی ہوں ہمارے ساتھ ہے۔ یہی بات حدیث الاوعال میں مذکور ہے[واللہ فوق العرش وھو یعلم ما أنتم علیه]یعنی (اللہ تعالیٰ عرش پرہےاورتمہارے ہر معاملےکوجانتا ہے)

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت، اس حقیقت کے ساتھ، جیسی اس ذات کے لائق ہے، اپنے ظاہری معنی کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی ذات کے مستوی علی العرش ہونے کے متعارض ومتناقض نہیں ہے، اس کی تین وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ: اللہ تعالیٰ نے دونوں حقیقتوں کواپنی کتابِ مبین میں بیان فرمایا ہے، کتابِ مبین ہرتناقض سے پاک ہے، ہماراایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں جن حقائق کا تذکرہ فرمایا ہے ان میں کوئی تناقض نہیں ہے اوراگرقرآنِ حکیم میں کسی مقام پرآپ کو بظاہرکوئی تناقض دکھائی دےتو دعویٔ تناقض کے بجائے وہاں تدبروتفکر سے کام لوتا آنکہ تناقض دور ہوجائے اورحق واضح ہوجائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَفَلَایَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًاکَثِیْرًا﴾

ترجمہ: (یہ لوگ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بڑا اختلاف اور تناقض پاتے) (النساء: ۸۲)

اور اگر تدبر کے باوجود مسئلہ کی حقیقت آپ پر واضح نہ ہو سکے تو راسخین فی العلم کا منہج اپنالو جو ایسے موقعہ پر وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن نے بتایا: ﴿اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ (ہم اس پر ایمان لاتے ہیں یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔)

چنانچہ اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو، جو کتاب کو نازل فرمانے والا ہے، اور جو حقیقی علم رکھتا ہے...... کمی اور کوتاہی آپ کے علم وفہم میں ہے (نہ قرآن مجید میں) قرآنِ حکیم تو ہر قسم کے تناقض سے پاک ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اپنے قولِ مذکور میں ''کما جمع الله بینهما'' کہہ کر اسی نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں خبر دی ہے کہ وہ اپنی خلق کے ساتھ ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ وہ اپنے عرش پر مستوی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحدید کی آیت میں ان دونوں حقیقتوں کا ذکر جمع فرما دیا ہے اور بتلایا ہے کہ اس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا فرمایا اور وہ اپنے عرش پر مستوی ہوا اور وہ اپنی خلق کے ساتھ ہے اس طرح کہ وہ اپنے عرش سے ان کے تمام اعمال کو دیکھتا ہے، جیسا کہ حدیث الاوعال میں ہے [اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر ہے اور تمہارے تمام امور کو دیکھ رہا ہے]

لہذا اللہ تعالیٰ کا علو (بلندی) پر ہونا، اسکے معیت مع الخلق کے متناقض نہیں اور اس کی معیت مع الخلق، اس کے علو کو باطل نہیں کرتا، بلکہ یہ دونوں حقیقتیں برحق ہیں۔ (مختصر الصواعق لابن الموصلی ص: ۴۱۰)

(۲) دوسری وجہ: معیت کا معنی حقیقۃً علو کے متناقض نہیں ہے، بلکہ معیت اور علو دونوں کا جمع ہونا ممکن ہے، بلکہ ایک مخلوق کے لیئے بھی ممکن ہے کہ اس میں معیت اور علو یکجا ہو جائیں۔ جیسے

کہا جاتا ہے: "مازلنا نسیر والقمر معنا" (ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ تھا) (حالانکہ چاند تو اوپر ہوتا ہے۔) یہاں کوئی تناقض بھی نہیں ہے، اور نہ ہی چاند کے ہمارے ساتھ ہونے کا یہ معنی ہے کہ چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ تو جب ایک مخلوق کے حق میں ان دونوں حقیقتوں کا جمع ہونا ممکن ہے تو پھر وہ خالق جو کائنات کی ہر شئی کا احاطہ کیئے ہوئے ہے اور سب سے بلندی پر اپنے عرش پر مستوی ہے، کے حق میں تو یہ دونوں حقیقتیں بالاولیٰ اکٹھی ہو سکتی ہیں...... پھر ہمیں یہ بات بخوبی معلوم ہو چکی ہے کہ معیت کا معنی و حقیقت قطعاً اس بات کی متقاضی نہیں ہے کہ جس کے ساتھ معیت ہو اس کے ساتھ ایک جگہ جمع ہونا ضروری ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے الفتویٰ الحمویہ (۱۰۲/۵) میں اس نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے " لفظ "مع" یعنی (ساتھ ہونا) جب استعمال کیا جائے گا تو لغت میں اس کا ظاہری معنی مطلقاً مقارنت و مصاحبت ہی ہوگا، جس کے ساتھ معیت، مذکور ہو اسے چھونا یا اسکے دائیں یا بائیں (یا آگے پیچھے) ہو کر اس سے مختلط ہونا ضروری نہیں ہے۔ جب سیاقِ کلام کے پیشِ نظر لفظِ "مع" کے کسی معنی کو مقید کیا جائے گا تو اسی معنی کی مقارنت مراد ہوگی۔ کہا جاتا ہے: ہم چلتے رہے اور چاند ہمارے ساتھ رہا، یا فلاں ستارہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔ اسی طرح اپنا سامان اگرچہ آپ نے اپنے سر کے اوپر اٹھا رکھا ہو مگر آپ کہتے ہیں: "هذا المتاع معی" (یہ سامان میرے ساتھ ہے) لہذا اللہ تعالیٰ حقیقتاً اپنی خلق کے ساتھ بھی ہے اور حقیقتاً اپنے عرش کے اوپر بھی ہے۔ "

اللہ تعالیٰ شیخ الاسلام پر کروڑوں رحمتیں برسائے انہوں نے بالکل سچ فرمایا: جو رب تعالیٰ، آپ کا مکمل علم رکھتا ہے، پوری طرح آپ پر مطلع اور محیط ہے، آپ کی ہر بات سنتا اور ہر فعل دیکھتا ہے، اور آپ کے ہر معاملے کی تدبیر فرماتا ہے، وہ درحقیقت آپ کے ساتھ ہی ہے، اگرچہ وہ حقیقتاً اپنے عرش کے اوپر ہے کیونکہ معیت ایک جگہ اکٹھا ہونے کو مستلزم نہیں ہے۔

(۳) تیسری وجہ: اگر معیت (ساتھ ہونا) اور علو (بلند ہونا) ہر دو صفات کے مخلوقین کے حق میں جمع ہونا ناممکن مان لیں تو اس سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ یہ دونوں حقیقتیں خالق کے حق میں بھی جمع نہیں ہوسکتی، وہ خالق جس نے خود ان دونوں صفات کو اپنے لیئے بیان فرمایا ہے، کیونکہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ کی مماثلت نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ کے العقیدہ الواسطیۃ (۱۴۲/۳) میں اسی نکتہ کی وضاحت فرمائی ہے: ” قرآن وحدیث میں جو اللہ تعالیٰ کا قرب ومعیت مذکور ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے ”علو“ و ”فوقیت“ کے منافی نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات میں اللہ تعالیٰ جیسی کوئی چیز نہیں ہے، وہ ذات قریب ہونے کے باوجود علو وبلندی پر ہے اور بلند ہونے کے باوجود قریب اور نزدیک ہے۔

تتمۂ بحث: اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت کے سلسلہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں

(۱) وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ معیت کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ مخلوقات کے امور واحوال کا علم واحاطہ رکھنے والا ہے، یہ معیتِ عامہ ہے۔ دوسرا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے خاص بندوں کی نصرت وتائید فرماتا ہے، یہ معیتِ خاصہ ہے۔ ان ہر دو معانی کے اپنے اپنے محل میں اقرار واثبات کے ساتھ ساتھ اس بات کا اقرار واثبات بھی ضروری ہے کہ وہ بذاتہ سب سے بلند ہے اور اپنے عرش پر مستوی ہے۔ یہ سلفِ صالحین کا عقیدہ ہے اور یہی مذہبِ حق ہے، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دلائل کے ساتھ بیان ہوا۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق کے ساتھ معیت کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زمین پر ان کے ساتھ موجود ومختلط ہے...... یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علو اور استواء علی العرش کی نفی کرتے ہیں...... یہ قدیم جہمیہ حلولیہ وغیرہ کا عقیدہ ہے۔ ان کا مذہب باطل اور انتہائی بدترین ہے، تمام سلفِ صالحین کا اس کے بطلان وانکار پر اجماع ہے۔ (کما تقدم)

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی خلق کے ساتھ معیت کا معنی ومقتضیٰ یہ ہے کہ وہ زمین پر ان کے ساتھ موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا اپنے عرش پر علو بھی ثابت ہے۔ یہ بات شیخ الاسلام نے مجموع الفتاویٰ (۵/۲۲۹) میں بعض لوگوں کے حوالے سے نقل فرمائی ہے۔

ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انہوں نے صفتِ معیت اور صفتِ علو، ہر دو کے نصوص کے معنیٰ ظاہر کو لیا ہے۔ یہ لوگ جھوٹے اور گمراہ ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معیت کے نصوص قطعاً اس کے حلول فی المخلوق ،جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں کے متقاضی نہیں ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حلول کا عقیدہ باطل ہے، اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے کلام کا معنیٰ ظاہر کبھی باطل نہیں ہوسکتا۔

تنبیہ: واضح ہو کہ علماءِ سلف سے اللہ تعالیٰ کی معیت کی تفسیر ان الفاظ میں منقول ہے:

''انه معهم بعلمه'' یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے علم کے اعتبار سے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف از روئے علم ساتھ ہے، بلکہ ربوبیت کے تمام معانی مثلاً: احاطہ، سمع، بصر، قدرت اور تدبیر وغیرہ کے ساتھ ہے۔

ایک اور تنبیہ: گزشتہ صفحات میں ہم نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا علو قرآن، حدیث، عقل، فطرت اور اجماع تمام دلائل سے ثابت ہے (ہم اس کی قدرے تفصیل عرض کرتے ہیں)

اللہ تعالیٰ کا علو (بلند ہونا) قرآنِ حکیم میں مختلف اور متنوع اسالیب کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

کہیں تو لفظِ ''العلو'' استعمال ہوا، جیسے ﴿وَهُوَ العَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾ (الشوریٰ:۴)

ترجمہ: (وہ بلند اور عظیم ہے)

کہیں لفظِ ''فوق''، مستعمل ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ﴾ (الانعام:۶۱)

ترجمہ: (اور وہی اپنے بندوں کے اوپر غالب ہے برتر ہے)

کہیں "استواء علی العرش" کا ذکر کرکے اس کے علو کو بیان کیا گیا: جیسے

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ (طہ:۵)

ترجمہ: (جو رحمٰن ہے عرش پر قائم ہے)

کہیں اللہ تعالیٰ کا آسمانوں پر ہونا مذکور ہے: ﴿ءَ أَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ (الملک:۱٦)

ترجمہ: (کیا تم اس بات سے بے خوف ہو گئے ہو کہ جو ذات آسمان پر ہے تمہیں زمین میں دھنسا دے)

کہیں اسکے علو کا اس طرح تذکرہ ملتا ہے کہ مختلف چیزیں اسکی طرف اوپر چڑھ کر جاتی ہیں:

﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ﴾ (القاطر:۱۰)

ترجمہ: (تمام تر ستھرے کلمات اس کی طرف چڑھتے ہیں اور نیک عمل ان کو بلند کرتا ہے)

﴿ تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ (المعارج:۴)

ترجمہ: (جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں)

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ (آل عمران:۵۵)

ترجمہ: (جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ! میں تجھے پورا لینے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اٹھانے والا ہوں)

کہیں اس کے علو کا ذکر اس طرح ہوا کہ مختلف چیزیں اس کی طرف سے نیچے آتی ہیں:

﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (النحل:۱۰۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل لے کر آئے ہیں)

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ (السجدۃ:۵)

ترجمہ: (وہ آسمان سے لیکر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے)

احادیث میں بھی اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کا بیان موجود ہے، چنانچہ اس موضوع پر مختلف اسالیب کے ساتھ قولی، فعلی اور تقریری ہر قسم کی اتنی احادیث موجود ہیں کہ ان کا مجموعہ حدِ تواتر کو پہنچتا ہے۔ جیسے:

نبی ﷺ کی سجدہ کے اندر دعا: [سبحان ربی الاعلیٰ]

(پاک ہے میرا رب جو سب سے بلند ہے) (مسلم مع النووی (۲۳/۵)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: [ان اللہ لما قضی الخلق کتب عندہ فوق عرشہ: ان رحمتی سبقت غضبی] یعنی (اللہ تعالیٰ نے جب خلق کی تخلیق کا فیصلہ فرمایا تو عرش پر اپنے پاس یہ لکھا: بے شک میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی) (متفق علیہ)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی اللہ تعالیٰ کے علو پر دال ہے: [ألا تأمنونی وأنا أمین من فی السماء] (صحیح بخاری مع الفتح (۶۶۶/۷)

یعنی (تم مجھے امین کیوں نہیں مانتے، حالانکہ میں آسمان والی ذات کا امین ہوں)

نبی ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: [اللھم أغثنا] (اے اللہ ہمیں بارش عطا فرما) (مسلم مع النووی (۱۹۲/۷)

یومِ عرفہ میں آپ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے لوگوں سے پوچھا: کیا میں نے پورا دین پہنچا دیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پورا دین پہنچا دیا، امانت اور خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔ اس پر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا: [اللھم اشھد] (اے اللہ! تو گواہ رہ) (بخاری مع الفتح (۵۸۵/۲) مسلم مع النووی (۱۸۴/۸)

آپ ﷺ نے لونڈی سے پوچھا: [این اللہ؟] (اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟) اس نے جواب دیا: [فی السماء] (آسمان کے اوپر) تو آپ ﷺ نے اس کی اس بات کی تقریر و تائید فرمائی اور اس کے آقا سے کہا [اعتقھا فانھا مؤمنة] (اسے آزاد کردو یہ مؤمنہ ہے) (مسلم مع النووی (۲۴/۵)

جہاں تک دلیلِ عقل سے صفتِ علو کے ثبوت کا تعلق ہے تو عقل کی دلالت وشہادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کیلئے وجوباً ہر صفتِ کمال کا اثبات ہو اور ہر صفتِ نقص سے اس کی تنزیہ اور پاکیزگی ہو......اور ظاہر ہے، علو صفتِ کمال ہے، اور سفل (نیچائی) صفتِ نقص۔ لہذا یہ بات متعین ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کیلئے صفتِ علو کا اثبات واجب ہے، اور اس کا نقیض یعنی سفل کی نفی ضروری ہے۔

فطرت بھی اللہ تعالیٰ کیلئے بدیہی طور پر صفتِ علو کے اثبات پر دال ہے، چنانچہ کوئی بھی دعا کرنے والا یا پریشان حال جب اپنے پروردگار کی طرف لاچار ہوتا ہے تو وہ اوپر کی طرف کیوں دیکھتا ہے؟ اس موقعہ پر وہ دائیں یا بائیں کیوں التفات نہیں کرتا؟ اس کے دل میں بداهۃً توجہ الی العلو کا خیال راسخ ومرتکز ہوتا ہے۔ نمازیوں سے پوچھو کہ سجدہ میں [سبحان ربی الاعلیٰ] کہتے ہوئے تمہارے دلوں کا اتجاہ کس طرف ہوتا ہے؟۔

جہاں تک دلیلِ اجماع کا تعلق ہے تو تمام صحابہ، تابعین اور ائمہ سلف کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں کے اوپر عرش پر مستوی ہے، اس بارہ میں ان کا کلام نصاً وظاہراً موجود ہے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں: ''کنا والتابعون متوافرون نقول ان اللہ تعالی ذکرہ فوق عرشہ ونؤمن بما جاء ت بہ السنۃ من الصفات''[1]

یعنی (ہم تابعین کی کثیر تعداد کی موجودگی میں کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے اوپر ہے، نیز ہم احادیثِ رسول ﷺ سے ثابت اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر ایمان لاتے ہیں)

بہت سے اہلِ علم نے اس پاکیزہ عقیدہ پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اور اس بارہ میں کسی کا مخالفت کرنا محال ہے، جبکہ اس عقیدۂ مبارکہ کو بڑے عظیم دلائل کی تائید ومطابقت بھی حاصل ہے۔

---

[1] اس اثر کو امام بیہقی نے ''الاسماء والصفات'' (۲/۱۵۰) اور الذہبی نے ''السیر'' (۷/۱۲۰، ۱۲۱) اور تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۸۱، ۱۸۲) میں ذکر کیا ہے، امام ذھبی نے اس اثر کو صحیح کہا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے ''الحمویۃ'' اور ابن القیم نے ''اجتماع الجیوش'' میں صحیح کہا ہے۔

ان دلائل کا وہی شخص انکار کرسکتا ہے جس میں کبر وطغیان کا عنصر ہو، جس کی بصیرتِ قلب مطموس ومشبوہ ہو اور جسے، شیاطین فطرتِ سلیمہ سے محروم ومنحرف کرکے اپنے ناپاک چنگل میں پوری طرح پھانس لیں۔ہم اللہ تعالیٰ سے عافیت وسلامتی کا سوال کرتے ہیں۔

تیسری تنبیہ: قارئینِ کرام! ایک مجلس میں ہم نے اللہ تعالیٰ کی اپنے خلق کے ساتھ اپنی معیت کے حوالے سے گفتگو کی، جسے بعض طلباء نے تحریر کردیا، پھر وہ تحریر منظرِ عام پر آگئی، اس وقت ہم نے اللہ تعالیٰ کی معیت کے بارہ میں یہ بتلایا:

'' ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ معیت حقیقی اور ذاتی ہے، ایسی معیت جو اسکی شانِ باکمال کے لائق ہے اور ایسی معیت جو اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ باعتبارِ علم، قدرت، سمع، بصر، بادشاہت اور تدبیر ہر شیٔ کا احاطہ کیئے ہوئے ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہو یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہو، بلکہ وہ اپنی ذات اور صفات کے ساتھ بلند ہے، اور بلندی پر ہونا اس کی وہ صفتِ ذاتیہ ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہوتی، اور وہ عرش پر مستوی ہے جیسے اس کی عظمت وجلالت کے لائق ہے، اور اس کا سب سے بلندی پر، عرش پر مستوی ہونا معیت مع الخلق کے منافی نہیں ہے، کیونکہ: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

(اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے دیکھنے والا ہے)''

واضح ہو کہ ہمارے اس بیان میں اللہ تعالیٰ کی معیت کیلئے ''ذاتی'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے ہمارا مقصود صرف حقیقتِ معیت کی تاکید تھا، یہ مقصود ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ زمین پر اپنی مخلوق کے ساتھ ہے۔(جیسا کہ حلولیہ کا عقیدہ ہے) ہم نے اسی بیان میں آگے ذکر کیا ہے کہ:......اللہ تعالیٰ اس بات سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ مخلوقات کے ساتھ مختلط ہو یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہو، بلکہ وہ اپنی ذات وصفات کے ساتھ بلند ہے اور بلندی پر ہونا اس کی وہ

صفتِ ذاتیہ ہے جو کبھی اس سے الگ نہیں ہوتی اور وہ عرش پر مستوی ہے.....الخ

اسی بیان میں، میں نے آگے چل کر یہ بھی کہا تھا:

"ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر جگہ ہے تو اگر یہ اس کا عقیدہ ہے تو وہ کافر اور گمراہ ہے اور اگر اس عقیدہ کو سلفِ صالحین یا ائمہ کرام کی طرف منسوب کرتا ہے تو انتہائی جھوٹا ہے۔"

ایک سمجھدار آدمی جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو اور کما حقہ اس کی قدر بجالاتا ہو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اپنی خلق کے ساتھ ہے۔ میں اپنی ہر مجلس میں کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت پر گفتگو آجائے اس کا انکار کرتا رہتا ہوں اور کرتا رہونگا، میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے تمام مسلمان بھائیوں کو دنیا اور آخرت میں کلمۂ توحید پر ثابت قدمی عطا فرمائے۔

اس کے بعد میں نے ایک مقالہ بھی تحریر کیا جو ریاض سے شائع ہونے والے مجلۃ "الدعوۃ" میں بروز پیر ۴ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ شمارہ نمبر ۹۱۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ میں میں نے وہی کچھ لکھا اور ثابت کیا جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ثابت کیا ہے، یعنی: اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت حق ہے اور حقیقت پر قائم ہے، لیکن وہ متقاضی حلول واختلاط بالخلق نہیں ہے چہ جائیکہ مستلزمِ حلول واختلاط ہو۔ اس مقالہ میں میں نے اللہ تعالیٰ کے علو کی حقیقت اور معیت مع الخلق کی حقیقت میں جمع کی وجوہات بیان کی ہیں۔ میں نے اپنی اس تحریر میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ میں اپنی سابقہ تحریر میں سے لفظ "ذاتی" ہٹانا ضروری سمجھتا ہوں (کیونکہ اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت بذاتہ ہے، جو قطعاً ہمارا مقصود نہیں)

واضح ہو کہ ہر وہ لفظ جو اللہ تعالیٰ کے بذاتہ زمین پر ہونے یا مخلوقات کے ساتھ مختلط ہونے، یا اس کے علو اور استواء علی العرش کی نفی کرنے پر منتج یا مستلزم ہو وہ باطل ہے، اس کا رد اور انکار

ضروری ہے، کہنے والا کوئی بھی ہو اور وہ جو لفظ بھی کہہ جائے۔

ہر وہ کلام جو خواہ بعض افراد کو ہی، اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارہ میں مبتلائے وہم کردے اس سے بچنا ضروری ہے، تاکہ ایک شخص بھی اس کے اُس ایک لفظ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے بارہ میں ظنِ سوء میں گرفتار نہ ہوجائے......لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارہ میں جو کچھ بھی اپنی کتابِ مقدس میں ثابت فرمایا، یا اپنے پیارے رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے کہلوایا اس کا اثبات فرض ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اوہام وشبہات پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف نامناسب اور غیر لائق عقائد منسوب کرنے والوں کا رد اور ان کی بیخ کنی بھی ضروری ہے۔(و اللہ المستعان)

ساتویں اور آٹھویں مثال: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿نَحۡنُ أَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ﴾(ق:١٦)

ترجمہ: ((اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں))

نیز فرمایا: ﴿وَنَحۡنُ أَقۡرَبُ إِلَيۡهِ مِنۡكُمۡ﴾(الواقعۃ:٨٥)

ترجمہ: (ہم اس شخص سے بہ نسبت تمہارے، بہت زیادہ قریب ہوتے ہیں)

یہاں ''قرب'' سے ملائکہ کا قرب مراد لیا گیا ہے(جو ظاہر سے عدول قرار پائے گا)

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تدبر وتفکر سے کام لیں تو یہاں قرب سے مراد ملائکہ ہی کا قرب ہے، اور ملائکہ کا قرب مراد لینا، معنیٰ ظاہر سے انحراف نہیں ہے(بلکہ ظاہرِ سیاق کا عین مقتضیٰ یہی ہے)

پہلی آیتِ کریمہ میں قرب، ایک ایسی قید کے ساتھ مقید ہے جس سے صراحۃً قربِ ملائکہ ظاہر ہورہا ہے، پوری آیتِ کریمہ ملاحظہ فرمائیے:

﴿نَحۡنُ أَقۡرَبُ اِلَيۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِيۡدِ. اِذۡ يَتَلَقَّى الۡمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الۡيَمِيۡنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيۡدٌ. مَايَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّالَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ﴾(ق:١٦تا١٨)

ترجمہ: (اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس سے قریب ہیں، جس وقت دو لینے والے جا لیتے ہیں ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف بیٹھا ہوا ہے، انسان منہ سے کوئی لفظ نکال نہیں پاتا مگر کہ اس کے پاس نگہبان تیار ہے)

ان آیاتِ مبارکہ میں قولہ تعالیٰ ﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ﴾ اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد ملنے والے دو فرشتوں (یعنی کراماً کاتبین) کا قرب ہے۔

دوسری آیت میں جس قرب کا ذکر ہے، وہ اس شخص کی حالت کے بیان کے ساتھ مقید ہے جس پر سکرات الموت طاری ہو جائیں، اور ظاہر ہے کہ سکرات الموت کے وقت ملائکہ ہی ظاہر ہوتے ہیں۔ جس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ﴾ (الانعام:٦١)

ترجمہ: (یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آ پہنچتی ہے تو اس کی روح ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) قبض کر لیتے ہیں، اور وہ ذرا کوتاہی نہیں کرتے)

علاوہ ازیں مذکورہ آیت میں قولہ تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ﴾ بھی قابلِ غور ہے، جو کہ اس بات کی بڑی صریح اور بین وواضح دلیل ہے کہ یہاں قرب سے ملائکہ کا قرب مراد ہے، کیونکہ ذکر یہ ہو رہا ہے کہ وہ چیز جس کے قرب کا ذکر ہو رہا ہے وہ اسی مقام پر موجود ہے مگر ہم اسے دیکھ نہیں سکتے، یہ بات اللہ تعالیٰ کے حق میں نہیں کی جاسکتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں کہنا امرِ محال ہے، لہذا یہ بات متعین ہوگئی کہ یہاں ملائکہ کا قرب ہی بیان ہوا ہے۔

ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پھر یہ قرب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا ہے؟ اور کیا اس قسم کی تعبیر قرآنِ حکیم میں اور کسی مقام پر ذکر ہوئی؟

جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کا قرب اپنی طرف اس لیئے منسوب فرمایا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے امر سے ہی قریب ہوتے ہیں، اور کیوں نہ؟ ملائکہ اللہ تعالیٰ ہی کا لشکر اور اس کے

نمائندے ہیں۔

اس قسم کی تعبیر کئی مقام پر مذکور ہے (یعنی فعلِ ملائکہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا)

کقولہ تعالیٰ: ﴿فَإِذَا قَرَأْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهٗ﴾ (القیامۃ:۱۸)

ترجمہ: (ہم جب اسے پڑھ لیں تو آپ اس کے پڑھنے کی پیروی کریں)

یہاں قرأت سے مراد جبرائیلِ امین کی قرأت ہے، جو وہ انزالِ وحی کے موقعہ پر رسول اللہ ﷺ پر فرمایا کرتے تھے، حالانکہ اسے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، تو چونکہ جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے امر سے قرأت فرماتے تھے، لہذا اللہ تعالیٰ کی طرف بھی قرأت کی نسبت واضافت صحیح ٹھہری۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ (ھود:۷۴)

ترجمہ: (جب ابراھیم کا ڈروخوف جاتا رہا اور اسے بشارت بھی پہنچ چکی تو ہم سے قومِ لوط کے بارہ میں جدال (جھگڑہ) کرنے لگے)

یہاں اللہ تعالیٰ نے ابراھیم علیہ السلام کے جدال اور جھگڑنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، حالانکہ انہوں نے ملائکہ کے ساتھ جدال کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کے نمائندے اور ایلچی کی حیثیت سے بشارت لیکر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

نویں اور دسویں مثال:

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے سفینہ کے بارہ میں فرمایا تھا: ﴿تَجْرِيْ بِأَعْيُنِنَا﴾

ترجمہ: (جو ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہی تھی) (القمر:۱۴)

نیز موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: ﴿وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ﴾ (طہٰ:۳۹)

ترجمہ: (تاکہ تیری پرورش میری آنکھوں کے سامنے کی جائے)

جواب: ان دونوں آیتوں کا معنی ومراد ظاہرِ کلام اور حقیقت پر مبنی ہے، لیکن غور یہ کرنا ہے کہ یہاں ظاہرِ کلام کیا چیز ہے؟ کیا ظاہرِ کلام یہ ہے کہ سفینۂ نوح اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں چل رہا تھا؟ اور موسیٰ علیہ السلام کی پرورش اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے اوپر ہو رہی تھی؟ یا پھر ظاہرِ کلام یہ ہے کہ سفینۂ نوح چل رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی آنکھ اس کی نگرانی وحفاظت فرما رہی تھی، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی پرورش وکفالت اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے سامنے اس کی نگرانی وحفاظت میں ہو رہی تھی۔

ان دونوں آیتوں کی ذکر کردہ پہلی تفسیر باطل ہے، اور اسکی دو وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ تعبیر کلام عرب، یا عربی تعبیر کے مقتضیٰ کے خلاف ہے، اور ظاہر ہے قرآنِ مجید عربی لغت میں نازل ہوا ہے۔ کقولہ تعالیٰ: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ (یوسف:۲)

ترجمہ: (یقیناً ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل فرمایا ہے، کہ تم سمجھ سکو)

نیز فرمایا ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ. عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ (الشعراء:۱۹۳تا۱۹۵)

ترجمہ: (اسے امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے، آپ کے دل پر اتارا ہے، کہ آپ آگاہ کر دینے والوں میں سے ہو جائیں، صاف عربی زبان میں ہے)

اب عربی لغت میں اگر کوئی شخص کہے: ''فلان یسیر بعینی'' تو اس کا معنی کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھے گا کہ فلاں اس کی آنکھ کے اندر چل رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص یوں کہے: ''فلان تخرج علی عینی'' تو کوئی شخص یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ سوار ہو کر اس کی آنکھ کے اوپر جا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہاں ظاہرِ خطاب کا یہی تقاضا ہے تو اس بات سے بے وقوف سے بے وقوف شخص ہنسے گا، عقلاء کی تو بات ہی چھوڑ دیئے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ معنی اللہ تبارک وتعالیٰ کے حق میں بالکل محال وممتنع ہے؛ کیونکہ

جسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی کما حقہ قدر بجالاتا ہے، ناممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارہ میں اس قسم کا فہم رکھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے اور اپنی مخلوق سے بالکل جدا ہے، نہ تو اس کی مخلوقات میں سے کوئی اس کے اندر حلول کرسکتا ہے، نہ وہ کسی کے اندر حلول کیئے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ پاک ہے اور ان چیزوں سے، بہت بلند ہے۔

جب لفظی ومعنوی اعتبار سے اس حقیقت کا بطلان ثابت ہوگیا تو پھر دوسری ذکر کردہ حقیقت متعین ہوگئی، وہی ان دونوں آیتوں کا معنیٰ ظاہر قرار پائے گی۔ یعنی (۱) سفینۂ نوح چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی آنکھ اس کی دیکھ بھال اور حفاظت فرمارہی تھی۔ (۲) اور موسیٰ علیہ السلام کی پرورش وکفالت اللہ تعالیٰ کی آنکھ کے سامنے اس طرح ہورہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کی دیکھ بھال اور حفاظت فرمارہا تھا۔

بعض سلفِ صالحین سے ان آیتوں کی تفسیر "بمرأی منی "منقول ہے، جس کا مطلب وہی ہے جو ہم نے اوپر تحریر کیا، کیونکہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی آنکھ سے ان کی نگرانی وحفاظت فرمارہا تھا تو اس کا لازمی تقاضہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا تھا، کسی بھی لفظ کے معنیٰ صحیح سے جو بھی چیز لازم آئے وہ صحیح قرار پاتی ہے، الفاظ کی دلالت مطابقی یا تضمنی یا التزامی کی معرفت رکھنے والوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے۔

گیارہویں مثال: ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان منقول ہے:

[ومایزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی أحبه فاذا أحببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بهاولئن سألنی لاعطینه ولئن استعاذنی لاعیذنه] (صحیح بخاری۶۵۰۲)

ترجمہ: [اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں

جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، پھر وہ مجھ سے جو کچھ مانگے گا عطا کرونگا، اور اگر میری پناہ طلب کرے گا تو پناہ دے دونگا۔] (یہ حدیث صحیح بخاری، باب التواضع میں مروی ہے جو کہ کتاب الرقاق کا ۳۸واں باب ہے)

جواب: سلف صالحین اہل السنۃ والجماعۃ نے اس حدیث کے ظاہر کو لیا ہے، (یعنی بلا تاویل قبول کیا ہے،) اور اسے اس کی حقیقت پر محمول کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں ظاہر حدیث کیا ہے؟ کیا ظاہرِ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کا کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہے؟ یا ظاہرِ حدیث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کو اس قدر سیدھا کر دیتا ہے کہ ان اعضاء سے اس کا کیا گیا ہر عمل، بلکہ اس کا مکمل شعور وادراک اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد پر قائم ہو جاتا ہے، اور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہو جاتا ہے۔

پہلا قول ظاہرِ حدیث نہیں ہو سکتا، بلکہ حدیث کے سیاق پر غور کرنے والا سمجھ جائے گا کہ پہلا قول اس حدیث کا مقتضیٰ بنتا ہی نہیں، چنانچہ حدیث کے اندر ہی اس قول کی نفی دو وجوہ سے موجود ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ اس حدیث کا اول حصہ یوں ہے: [اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے، حتی کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں] اور آخری حصہ میں یہ الفاظ مروی ہیں: [اور اگر وہ مجھ سے کچھ مانگے گا تو میں اسے ضرور عطا فرماؤنگا اور اگر میری پناہ طلب کرے گا تو میں اسے ضرور پناہ عطا فرماؤنگا] اس حدیث سے دو ذاتیں ثابت ہو رہی ہیں۔

ایک عبد (بندہ) اور دوسری معبود۔

ایک متقرِب (قرب حاصل کرنے والا) دوسرا متـقرَّب إليه (جس کا قرب حاصل کیا جائے)

ایک محب (محبت کرنے والا) دوسرا محبوب (جس سے محبت کی جائے)

ایک سائل (مانگنے والا) دوسرا مسئول (جس سے مانگا جائے)

ایک معطیٰ (جسے دیا جائے) دوسرا معطِی (دینے والا)

ایک مستعیذ (پناہ طلب کرنے والا) دوسرا مستعاذ بہ (جس سے پناہ طلب کی جائے)

ایک معاذ (جسے پناہ دی جائے) دوسرا معیذ (پناہ دینے والا)

گویا سیاقِ حدیث سے دو جدا ذاتیں ثابت ہو رہی ہیں، جن میں سے ہر ذات دوسرے کی غیر ہے۔ جب دو ذاتیں اس قدر جدا اور متباین ہونگی تو پھر ایک ذات، دوسری ذات کا کوئی وصف یا جزء کیسے بن سکتی ہے؟ یہ امرِ ممتنع ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ولی کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں ایک مخلوقِ حادث کے اوصاف یا اجزاء ہیں، جو پہلے معدوم تھا، بعد میں وجود میں آیا۔ کوئی دانا انسان یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ اس خالق کو کہ جو ازل سے ہے اور جس سے قبل کوئی چیز نہیں تھی، مخلوق کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں قرار دے۔ بلکہ اس فاسد معنی کے تصور ہی سے دل کانپ اٹھتا ہے زبان گنگ ہو جاتی ہے اور بولنے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ خواہ یہ معنی بفرضِ محال تھوڑی دیر کیلئے ہی مراد لیا جائے......تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس معنی کو اس حدیثِ قدسی کا ظاہر قرار دیا جائے، اور سلفِ صالحین کے بیان کردہ صحیح معنی کو معنی ظاہر سے انحراف قرار دیا جائے؟ اے اللہ تو پاک ہے، تیری ہی حمد و بادشاہت ہے، ہم تیری ثناء بیان نہیں کر سکتے، جسطرح کہ تو نے اپنی ثناء بیان فرمائی ہے۔

اس حدیث کے معنی میں ذکر کردہ جب پہلے قول کا باطل و ممتنع ومحال ہونا ثابت ہو گیا تو پھر دوسرا قول متعین ہو گیا، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے ولی بندے کو اس کے سمع، بصر اور ہر عمل میں اس قدر سیدھا پن واصلاح واستقامت عطا فرما دیتا ہے، کہ اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور پاؤں کے ہر عمل میں اس کا ادراک از روئے اخلاص اللہ تعالیٰ کیلئے ہو جاتا ہے، اور از روئے استقامت

اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہوجاتا ہے اور ازروئے شریعت واتباع اللہ تعالیٰ کی راہ میں بن جاتا ہے، چنانچہ اسے کمال درجے کا اخلاص، استقامت اور متابعت بصورتِ تمام میسر آجاتا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلیٰ درجے کی توفیق شمار ہوتی ہے۔

سلفِ صالحین سے یہی تفسیر منقول ہے، جو ظاہرِ حدیث کے عین مطابق، حقیقتِ حدیث کے عین موافق اور سیاقِ حدیث کیلئے بالکل متعین ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی تاویل کا سہارا لیا گیا ہے اور نہ ہی معنیٔ ظاہر سے انحراف اختیار کیا گیا ہے۔ (وللہ الحمد والمنۃ)

بارہویں مثال: رسول اللہ ﷺ ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نقل فرماتے ہیں:

[من تقرب منی شبرا تقربت منه ذراعا ومن تقرب منی ذراعا تقربت منه باعاومن أتانی يمشی أتيته هرولة]

ترجمہ:[جو شخص بالشت بھر میرے قریب آئے گا میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاؤنگا، اور جو ایک ہاتھ قریب آئیگا میں ایک گز اس کے قریب ہو جاؤنگا، اور جو میرے پاس چل کر آئے گا میں اس کی طرف دوڑ کر جاؤنگا]

یہ حدیث صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء میں ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے مروی ہے، امام مسلم نے اس معنی کی روایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت فرمائی ہے، جبکہ صحیح بخاری، کتاب التوحید کے پندرھویں باب میں اسی قسم کی ایک حدیث بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ مروی ہے۔

یہ حدیث دیگر نصوص کی طرح اللہ تعالیٰ کے چند افعالِ اختیاریہ پر مشتمل ہے، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ''فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ'' ہے (یعنی جو ارادہ فرمائے وہی کرتا ہے) کتاب وسنت کے بہت سے نصوص میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے افعالِ اختیاری مذکور ہیں: مثلاً: اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾

ترجمہ:(جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں)(۱۸۶/۲)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا﴾(الفجر:۲۲)

ترجمہ:(اور تیرا رب (خود) آجائے گا اور فرشتے صفیں باندھ کر (آجائیں گے)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلَائِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ

يَأْتِيَ بَعْضُ آيَاتِ رَبِّکَ ......﴾(الانعام:۱۵۸)

ترجمہ:(کیا یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی آئے؟)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾(طہ:۴)

ترجمہ:(رحمٰن ہے،عرش پر مستوی ہوا)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[ينزل ربنا الى سماء الدنيا حين يبقى ثلث الليل الآخر]

ترجمہ:[جب رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو ہمارا پروردگار آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:[ماتصدق أحد صدقة من طيب ولا يقبل الله الا الطيب الا أخذ ها الرحمن بيمينه]

ترجمہ:[جو کوئی شخص کسبِ حلال سے صدقہ دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ صرف کسبِ حلال ہی قبول فرماتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو دائیں ہاتھ میں لے لیتا ہے......]

اس کے علاوہ بہت سی آیات واحادیث ہیں جن میں اللہ رب العزت کے چند افعالِ اختیاریہ انجام دینے کا ذکر ہے۔

واضح ہو کہ مذکورہ بالا حدیث میں جو اللہ تعالیٰ کے دو افعال کا ذکر ہے،(ایک اس کا بندوں کے قریب ہونا، دوسرا اس کا بعض بندوں کی طرف دوڑنا) یہ بھی اسی قبیل سے ہیں۔سلفِ صالحین اہل السنۃ والجماعۃ اس قسم کے نصوص کو ان کے ظاہری وحقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں، وہ معنی جو اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان ہے، جو ہر قسم کی تکییف (بیانِ کیفیت) اور تشبیہ وتمثیل سے پاک ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۴۶۶/۵) میں حدیثِ نزول کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اللہ رب العزت کا اپنے بعض بندوں کے قریب ہونا، اللہ رب العزت کی وہ صفت ہے جو دیگر افعالِ اختیاریہ مثلاً: اللہ تعالیٰ کا آنا، اللہ تعالیٰ کا نزول فرمانا، اللہ تعالیٰ کا عرش پر مستوی ہونا، کی طرح اللہ تعالیٰ کیلئے ثابت ہے، اور یہ کہ اللہ رب العزت اپنے افعالِ اختیاریہ خود انجام دیتا ہے، سلفِ صالحین، معروف أئمہ اسلام اور اہل الحدیث کا یہی مذہب ہے، اور اس حوالے سے ان کے اقوال تواتر کے ساتھ منقول ہیں "

اب وہ کون سا مانع ہے جو اللہ رب العزت کے اپنے بندے کے قریب ہونے میں رکاوٹ بنے، اللہ تعالیٰ اپنے علو پر قائم رہتے ہوئے، جس طرح چاہے اپنے بندے کے قریب ہو جائے۔ اسی طرح وہ کون سا مانع ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت "اتیان، مجیء" (یعنی آنے) سے مانع ہو؟ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے (جیسے اس ذات کے لائق ہے) آتا ہے، ہم اس کے آنے کی نہ تو کیفیت بتلا سکتے ہیں، نہ اس کے آنے کو کسی مخلوق کے آنے کے مشابہ قرار دے سکتے ہیں۔

ان صفات کا اللہ تعالیٰ کیلئے اثبات سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ عین اللہ تعالیٰ کے کمال کا مظہر ہیں، اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ "فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ" یعنی جو چاہتا ہے کر لیتا ہے، بالکل اس طریقہ سے جو اس ذاتِ پاک کے لائق اور شایانِ شان ہو۔

کچھ لوگ مذکورہ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کے فرمان: [أتيته هرولة] یعنی میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں، سے مراد اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے پر جلد متوجہ ہونا اور جلدی سے دعا قبول کرنا، لیتے ہیں۔ یہ اس بندے کیلئے ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی اور طلبگار رہے، اور اس کے لیئے اپنے دل اور تمام اعضاء کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کو اس کے عمل سے کہیں بڑھ کر بڑی تیزی کے ساتھ جزاء عطا فرما دیتا ہے۔

انہوں نے اپنے اس معنی و مراد کی توجیہ اس طرح کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کے حوالے سے بھی یوں فرمایا ہے: [ومن اتاني يمشي] کہ جو میرے پاس چل کر آئے گا۔ اور یہ بات

معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا متلاشی اور اس کے وصل کا طالب، اس قرب ووصل کو محض قدموں سے چل کرنہیں پاتا۔

یہ درست ہے کہ بعض اوقات چلنا باعثِ اجروثواب ہوتا ہے، جیسا کہ مساجد کی طرف چل کر جانا، مشاعرِ حج اور جہادِ فی سبیل اللہ کیلئے چلنا وغیرہ۔لیکن اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول کے اور بھی بہت سے ذرائع ووسائل ہیں، مثلاً: رکوع وسجود وغیرہ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[إن اقرب مایکون العبد من ربه وهو ساجد]

ترجمہ: [بندہ سب سے زیادہ اپنے پروردگار کا قرب اس وقت پاتا ہے جب وہ سجدے میں ہو]

بلکہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کا قرب ووصل ایک قدم چلے بغیر، بستر پر لیٹے لیٹے حاصل ہوسکتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ (آل عمران:۱۹۱)

ترجمہ: (جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں)

رسول اللہ ﷺ نے عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

[صل قائما فان لم تستطع فقاعدافان لم تستطع فعلى جنب]

یعنی [تم کھڑے ہوکر نماز پڑھو اور اگر کھڑے ہونے کی استطاعت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھ لو اور اگر بیٹھ کر پڑھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو کے بل لیٹے لیٹے پڑھ لو]

ان لوگوں کا کہنا ہے کہ: جب یہ بات طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا حصول چلنے کے بغیر بھی بہت سے طرق سے حاصل ہوسکتا ہے تو پھر اس حدیث کی مراد اس امر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس کے عمل کی جزاء دیتا ہے، چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور اس کے قرب کی طلب میں سچا ہو، خواہ وہ سست رفتار ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کے عمل سے کہیں اکمل وافضل جزاء عطا فرمائے گا۔

لہذا مذکورہ شرعی قرینہ جو اس حدیث کے سیاق سے مفہوم ہو رہا ہے کی روشنی میں یہی معنی، معنیٰ ظاہر قرار پائے گا۔ اس معنی پر اہل السنۃ کو خروج عن الظاہر کا الزام دینا درست نہیں (کیونکہ یہ معنی سیاقِ حدیث سے شرعی قرینہ کے پیشِ نظر کیا گیا ہے) نہ ہی اس معنی کو معطلہ کے انداز کی تاویل قرار دیکر اہل السنۃ کے خلاف کوئی حجت قائم کی جاسکتی ہے۔ (و للہ الحمد)

اس قول کا جو بھی قائل ہے وہ اس وجیہ اور قابلِ غور اجتہاد و استدلال پر مستحق اجر ہے۔ مگر ہم پہلے قول کو زیادہ واضح، پُر عافیت اور مذہبِ سلف کے زیادہ لائق اور قریب ترین قرار دیتے ہیں۔

(جس کا ملخص یہ ہے کہ اس قسم کے امور اللہ تعالیٰ کے افعالِ اختیاریہ کے ضمن میں ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے انجام دیتا ہے اور اس طرح انجام دیتا ہے کہ اس کا علو واستواء علی العرش بھی ثابت و برقرار رہتا ہے، اور ان افعالِ اختیاریہ کی نہ تو ہم کیفیت جانتے ہیں نہ ان کے بارہ میں تشبہ بالمخلوقات کا عقیدہ رکھتے ہیں)

واضح ہو کہ مذکورہ قول کے قائل نے جس قرینہ سے مذکورہ استدلال کیا ہے، اس کا جواب ممکن ہے، اس قائل نے اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول اور اس تک رسائی حاصل کرنے کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ صرف ''مشی'' یعنی چلنے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اور بھی بہت سے طرق ہیں، کما تقدم۔ (لہذا جس طرح بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف چل کر جانا حقیقی معنی پر محمول نہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ کا بندے کی طرف دوڑ کر آنا محمول بر حقیقت نہیں ہوگا) اس کا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ حدیث میں چلنے کا ذکر علی سبیل المثال ہے، نہ کہ علی سبیل الحصر۔ لہذا حدیث میں اگر ''مشی'' یعنی چلنے کا ذکر ہے تو اس سے مقصود ان عبادات کی مثال دینی ہیں جو ''مشی'' سے حاصل ہوتی ہیں، جیسے مساجد کی طرف چل کر جانا اور جیسے بیت اللہ کا طواف اور صفا، مروہ کی سعی وغیرہ۔ واللہ اعلم

تیرہویں مثال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَالَهُمْ مِمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَا اَنْعَامًا﴾ (یس:۷۱)

ترجمہ: (کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کیلئے چوپائے جانور بھی پیدا کردیئے)

جواب: پہلے اس آیت کے ظاہری وحقیقی معنی کا تعین ضروری ہے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ یہاں معنیٰ ظاہر سے انحراف کی کیا شکل ہے؟

کیا اس آیت کا ظاہری وحقیقی معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، جیسا کہ آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے خلق فرمایا؟ یا اس آیت کا ظاہری معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپاؤں کو اس طرح پیدا فرمایا جس طرح دیگر مخلوقات کو پیدا فرمایا (یعنی اپنے ہاتھ سے نہیں) بلکہ تخلیقِ انعام کی نسبت اپنے ہاتھ کی طرف فرمائی ہے، مراد اپنی ذات ہے (یعنی صاحب الید) جس عربی لغت میں قرآن مجید کا نزول ہوا اس میں یہ اسلوب معروف ہے۔

پہلا قول آیتِ مذکورہ کا ظاہر نہیں بن سکتا اور اس کی دو وجوہات ہیں:

(۱) پہلی وجہ یہ کہ جس عربی لغت میں قرآنِ حکیم کا نزول ہوا اس میں آیتِ کریمہ میں استعمال شدہ لفظ کا ظاہری تقاضہ یہ نہیں بنتا، اس سلسلہ میں مزید مثالیں ملاحظہ ہوں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ﴾ (الشوریٰ ۳۰)

ترجمہ: (تمہیں جو کچھ مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے)

نیز فرمایا: ﴿ظَهَرَ الۡفَسَادُ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ بِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِی النَّاسِ لِیُذِیۡقَهُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ عَمِلُوۡا لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ﴾ (الروم:۴۱)

ترجمہ: (خشکی اور تری میں لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کے باعث فساد پھیل گیا، اس لیئے کہ انہیں ان کے بعض کرتوتوں کا پھل اللہ تعالیٰ چکھا دے بہت ممکن ہے کہ وہ باز آجائیں)

نیز فرمایا: ﴿ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ﴾ (آل عمران:۱۸۲)

ترجمہ: (یہ تمہارے ہاتھوں کے بھیجے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہے)

ان آیات میں اگر چہ کمانے اور بڑھانے کی نسبت ہاتھوں کی طرف ہے، مگر مراد انسان کی ذات ہے، لہذا ہاتھوں کے بغیر بھی اگر کسی معصیت کا ارتکاب کرے گا تو وہ پکڑ کا باعث بنے گی......البتہ کلامِ عرب کی روشنی میں اگر کوئی شخص یوں کہے: ''عملتہ بیدی ''یعنی فلاں کام میں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے، تو اس سے مراد ہاتھ کا عمل ہی ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ﴾

ترجمہ: (ان لوگوں کیلئے ''ویل'' ہے جو اپنے ہاتھوں کی لکھی ہوئی کتاب کو اللہ تعالیٰ کی طرف کی کہتے ہیں) (البقرۃ:۷۹)

یہاں براہِ راست ہاتھ سے کیا جانے والا عمل مراد ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آیتِ مذکورہ کا معنیٰ مراد یہی ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے تو آیتِ کریمہ یوں ہوتی: ''خَلَقْنَا لَهُمْ بِاَيْدِيْنَا اَنْعَامًا ''(یعنی ہم نے ان کیلئے اپنے ہاتھوں سے چوپایوں کو پیدا فرمایا) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خلقِ آدم علیہ السلام کے حوالے سے ارشاد فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ (ص:۷۵) (تجھے اسے سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا)

کیونکہ قرآنِ حکیم بیان وتوضیح کیلئے ہے نا کہ تعمیہ (اندھیرے میں رکھنے) کیلئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل:۸۹)

ترجمہ: (اور ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے، جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے)

جب قولِ اول کا بطلان واضح ہوگیا تو قولِ ثانی کا صحیح ہونا طے پا گیا۔ جس کا ملخص یہ ہے کہ یہاں ظاہرِ آیت اس امر کی متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چوپایوں کو بھی دیگر تمام مخلوقات کی طرح پیدا فرمایا ہے، یعنی چوپایوں کو (آدم علیہ السلام کی طرح) اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا۔ لیکن خلقِ انعام کی اپنے ہاتھ کی طرف نسبت فرمائی، جس سے مراد اپنی ذات ہے۔ لغتِ عربیہ کا یہی مقتضیٰ ہے۔

البتہ جب کسی فعل کو اپنی ذات کی طرف منسوب کر کے حرفِ "باء" کے ذریعے "ید" یعنی ہاتھ کی طرف متعدی کر دیا جائے، تو اس سے مراد اس عمل کا ہاتھ کے ذریعے ہی انجام دینا ہے...... دونوں جملوں کے استعمال میں فرق کو بخوبی سمجھ لیجئے، کیونکہ متشابہات میں فرق کیلئے ان اسالیب وتراکیب کا فہم، علم کی انتہائی عمدہ قسم ہے، اس فہم سے بہت سے اشکال خود بخود درفع ہوجاتے ہیں۔

چودھویں مثال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ﴾ (الفتح:١٠)

ترجمہ: (جولوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ ہے)

جواب: اس آیت کے ضمن میں دو جملے قابلِ غور ہیں:

(۱) پہلا جملہ: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ﴾ ہے۔ سلفِ صالحین اہل السنۃ نے اس آیتِ کریمہ کا ظاہری وحقیقی معنی مراد لیا ہے، جو یہ ہے کہ صحابہ کرام نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح:١٨) ترجمہ: (یقیناً اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے خوش ہوگیا جب کہ وہ درخت تلے تجھ سے بیعت کر رہے تھے)

آیتِ کریمہ: ﴿إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللهَ﴾ سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ صحابہ کرام نے ذاتِ باری تعالیٰ سے بیعت کی، نہ ہی اس معنی کے متعلق آیتِ کریمہ کے ظاہری معنی ہونے کا دعویٰ کیا جائے، کیونکہ یہ معنیٰ آیتِ کریمہ کے ابتدائی حصہ کے خلاف ہے، نیز پیش کردہ دوسری آیت کے بھی خلاف ہے، نیز امرِ واقع کے بھی خلاف ہے، (امرِ واقع یہ ہے کہ تمام صحابہ نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی) نیز یہ معنی اللہ تعالیٰ کے حق میں ناممکن ومحال ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بیعت کو اپنی بیعت اس لیئے قرار دیا کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول، نمائندے اور

ایلچی ہیں، اور یہ بات معلوم ہے کہ صحابہ کرام نے یہ بیعت، جہادِ فی سبیل اللہ کے اہم نکتہ پر کی تھی، لہذا رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر اس ذات کی راہ میں کہ جس نے آپ ﷺ کو بھیجا، جہاد کی بیعت، اس بھیجنے والی ذات کی بیعت ہی قرار پائے گی، کیونکہ آپ ﷺ اس ذات کے رسول ہیں، اور اس کے دین کو پہنچانے والے ہیں۔ یہ بالکل ویسا ہی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت درحقیقت اس ذات کی اطاعت ہے، جس نے آپ ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾

یعنی جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی)

صحابہ کرام کی اس بیعت کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت واضافت میں کئی ارفع واعلیٰ حکمتیں پنہاں ہیں، جن میں:

☆ رسول اللہ ﷺ کے شرف وعظمت کا اظہار۔

☆ آپ ﷺ کی نصرت وتائید کا اعلان۔

☆ اس بیعت کی عظمت وجلالتِ شان کا بیان۔

☆ اور بیعت کرنے والوں کی رفعتِ شان کا اقرار واثبات، قابل ذکر ہیں۔

ان تمام حوالوں سے اس بیعت کا معاملہ بالکل ظاہر وواضح ہے، اور کسی ذی عقل سے مخفی نہیں ہے

دوسرا جملہ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿يَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَيۡدِيۡهِمۡ﴾

ترجمہ: (اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر تھا)

یہ جملہ بھی ظاہری وحقیقی معنی پر محمول ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بیعت کرنے والوں کے اوپر تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ، اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے، لہذا اس کا ہاتھ سب سے اوپر ہے۔ یہی اس آیتِ کریمہ کا ظاہر وحقیقت ہے۔ اور یہ جملہ بطورِ تاکید ہے، یعنی نبی ﷺ کی بیعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی بیعت ہے......اس

سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کو چھو رہا تھا۔ جیسے آپ کہتے ہیں: ''السماء فوقنا ''یعنی آسمان ہمارے اوپر ہے۔ تو اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ ہمارے سروں سے مس ہو رہا ہے، بلکہ وہ تو ہم سے جدا اور ہم سے کہیں دور ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں کے اوپر ہونا اسی عقیدہ کے ساتھ منسلک ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق سے جدا، سب سے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہے۔

واضح ہو کہ یہاں کسی شخص کیلئے قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ﴾ کے تحت یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ سے مراد نبی ﷺ کا ہاتھ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ہاتھ کی نسبت اپنی ذات کی طرف فرمائی ہے، اور پھر اپنے ہاتھ کے بارہ میں فرمایا: کہ وہ ان کے ہاتھوں کے اوپر تھا۔ جب کہ نبی ﷺ کا ہاتھ بیعت کے وقت صحابہ کے ہاتھوں کے اوپر نہیں ہوتا تھا، بلکہ آپ ﷺ اپنا ہاتھ ان کی طرف پھیلا دیتے اور مصافحہ کے انداز سے ان کے ہاتھوں کو پکڑ لیتے، تو آپ ﷺ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے ساتھ ہوتا نہ کہ اوپر۔

پندرہویں مثال: ایک حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

[یاابن آدم مرضت فلم تعدنی](الحدیث)

واضح ہو کہ یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے، اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح مسلم میں بروایت ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ نقل فرمایا ہے، (کتاب البر والصلة والآداب (رقم ۴۳ ص ۱۹۹) مکمل حدیث ملاحظہ ہو:

[عن ابی هريرة رضی الله عنه قال :قال رسول الله ﷺ :ان الله تعالیٰ يقول يوم القيامة :يا ابن آدم مرضت فلم تعدنی قال:يارب كيف اعودک وانت رب العالمين قال:اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده اما علمت انک لو عدته لوجدتنی عنده يا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی قال:يارب وكيف

اطعمک وانت رب العالمین قال: اما علمت انه استطعمک عبدی فلان فلم تطعمه اما علمت لو أطعمته لوجدت ذلک عندی یاابن آدم استسقیتک فلم تسقنی قال :یارب کیف اسقیک وانت رب العالمین قال: استسقاک عبدی فلان فلم تسقه اما انک لو سقیته وجدت ذلک عندی]

ترجمہ: [ابوھریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی؟ بندہ کہے گا: میں تیری کیسے عیادت کرتا تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تمہیں معلوم نہ تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، تو نے اس کی عیادت نہیں کی، کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا، مگر تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا؟ بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تو نہیں جانتا؟ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے اسے نہیں کھلایا، تجھے معلوم نہیں اگر تو اسے کھانا کھلا دیتا تو اس کا صلہ میرے ہاں پالیتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا، مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ بندہ کہے گا: اے اللہ میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو تو رب العالمین ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا مگر تو نے اسے پانی نہیں پلایا، اگر تو اسے پانی پلا دیتا تو اس کا صلہ میرے پاس پالیتا۔]

جواب: سلفِ صالحین نے اس حدیث کے ظاہر ہی کو لیا ہے، اور بھلا وہ ظاہر سے عدول کی جسارت کیسے کرسکتے ہیں، اور وہ بھی ان لوگوں کی طرح جو نصوص میں تحریف جیسے فعلِ شنیع کا ارتکاب کرکے اپنی من مانی خواہشات کے ذریعے خطیاں مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سلفِ صالحین نے اس حدیث کی وہ تفسیر کی ہے جو اس کے متکلم (اللہ تعالیٰ) نے کی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: میں بیمار ہوا...... میں نے تجھ سے کھانا مانگا...... میں نے تجھ سے پانی مانگا...... وہ جملے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے خود ہی تفسیر کردی۔ چنانچہ بندے کے استفسار پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ بیمار ہوگیا تھا...... میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا...... میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا...... اللہ تعالیٰ کی یہ تفسیر اس بات کی صریح دلیل ہے کہ بیمار ہونے والا اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کوئی بندہ تھا۔اسی طرح کھانا اور پانی طلب کرنے والا اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ تھا۔اب یہ تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی جو اس حدیث کا متکلم ہے اور جو اسکی مراد کو سب سے زیادہ اور بہتر جاننے والا ہے۔لہذا اگر ہم اس مرض کی، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، یا وہ کھانا طلب کرنا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے یا وہ پانی مانگنا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، کی تفسیر بندے کے مرض سے کریں، یا اس کے کھانا یا پانی طلب کرنے سے کریں تو یہ تو کوئی تاویل ہے نہ تحریف ہے، اور نہ ہی معنیٰ ظاہر سے عدول وانحراف، کیونکہ یہ تفسیر خود اللہ تعالیٰ نے فرمادی ہے...... اب اسے یوں ہی سمجھیئے جیسے اللہ تعالیٰ ان امور کو اپنی طرف منسوب کیئے بغیر ابتداءً اپنے بندوں کی طرف منسوب فرمارہا ہے۔

اب سوال یہ باقی رہ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان امور کو اپنی ذات کی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فقط ترغیب وتحریض کا معنی اجاگر کرنے کیلئے۔جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ (البقرۃ:۲۴۵)

ترجمہ: (ایسا بھی کوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرضِ حسنہ دے)

(اب بھلا اللہ تعالیٰ کو قرض کی کیا حاجت؟ بس اللہ تعالیٰ نے اس اسلوب کے ذریعے صدقہ کی اہمیت اور اس پر ترغیب وتحریض کا پہلو اجاگر فرمایا۔)

یہ حدیث سب سے بڑی اور قوی دلیل ہے، جو ان اہل تاویل کہ جو کتاب وسنت کی دلیل کے

بغیر ہی نصوصِ صفاتِ باری تعالیٰ کو ان کے ظاہر سے بصورتِ تحریف پھیرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں، کے سروں پر ضرب کاری ہے۔ ان کی تمام تر تحریفات اور تاویلات کی بنیاد ان کے وہ شبہات ہیں جن میں وہ خود ہی متناقض، مضطرب اور متحیر ہیں۔ کیونکہ ان نصوص کی مراد اگر معنیٰ ظاہر کے خلاف ہوتی تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ ضرور بالضرور اسے بیان فرمادیتے، اور اگر ان نصوص کا ظاہر اللہ تعالیٰ پر ممتنع ہوتا تو بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ اس کا ضرور بیان فرمادیتے، جیسا کہ اس حدیث میں فرمادیا، اور اگر ظاہرِ نصوص جو (سلفِ صالحین کے بیان کے مطابق) اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، (بقول اہلِ تاویل) اللہ تعالیٰ کے حق میں ممتنع ہوتا تو کتاب وسنت میں ایسی بے شمار مثالیں ہوتیں جو اللہ تعالیٰ کی ان صفات پر مشتمل ہوتیں، جو اللہ تعالیٰ پر (بقول اہلِ تاویل) ممتنع ہوتیں، اور ان کا اثبات بڑے تکلف کے ساتھ کرنا پڑتا...... یہ سب سے بڑا محال ہے۔

ہم اسی قدر مثالوں کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں، تاکہ ہماری یہ ذکر کردہ مثالیں دوسری مثالوں کے لیئے مشعلِ راہ بن جائیں، ورنہ نصوصِ صفات کے تعلق سے اہل السنۃ کا قاعدہ معروف ہے، اور وہ یہ کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق تمام آیات واحادیث کو ان کے معنیٰ ظاہر پر برقرار رکھو اور ان میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف یا تمثیل وتشبیہ کا ارتکاب نہ کرو۔

گزشتہ اوراق میں قواعدِ صفاتِ باری تعالیٰ کے بیان میں تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔

(والحمد للہ رب العالمین)

خاتمہ

اگر کوئی شخص کہے : ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں اہلِ تاویل کا مذہب باطل ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ سب سے زیادہ صفات میں تاویلیں گروہِ اشاعرہ کی ہیں، تو پھر ان کا مذہب کیونکر باطل ہوسکتا ہے، جبکہ یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں ان کی تعداد ۹۵٪ ہے، نیز یہ کہ اس باب میں ان کا امام ومقتدیٰ ابوالحسن الاشعری جیسی شخصیت ہے، تو پھر ان کا مذہب کیسے باطل ہوسکتا ہے؟ پھر ان میں فلاں اور فلاں بڑے بڑے علماء ہیں جن کی اللہ تعالیٰ، رسول اللہ ﷺ، قرآن وحدیث اور حکام ورعیت کیلئے خیر خواہی کے جذبات معروف ومسلّم ہیں، تو پھر ان کا مذہب کیسے باطل ہوسکتا ہے؟

جواب: پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ دنیا کے تمام فرقوں اور جماعتوں میں اشاعرہ کی تعداد ۹۵٪ ہے، یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا اثبات انتہائی دقیق اعداد وشمار کا طالب ومتقاضی ہے۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ وہ اتنی یا اس سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں، تو یہ تعداد ان کے معصوم عن الخطاء ہونے کی ہرگز دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ عصمت مسلمانوں کے اجماع میں ہے نہ کہ کثرتِ تعداد میں۔

اب ہم غور کرتے ہیں کہ دورِ قدیم کے مسلمانوں کا اجماع کس چیز پر قائم ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ دورِ قدیم کے مسلمانوں کا اجماع اہلِ تاویل کے مذہب کے خلاف قائم ہے۔

چنانچہ اس امت کے سلفِ صالحین کا پہلا گروہ صحابہ کرام کا تھا، جن کے دور کو خیر القرون کہا گیا تھا، پھر ان کے بعد تابعین اور بعد میں آنے والے تمام ائمہ ہدایت اس بات پر مجمع اور متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کیلئے جو اسماء وصفات بیان فرمادیئے ان کا اثبات اور اقرار واعتراف کیا جائے، ان تمام کو ان کے معنیٰ ظاہر پر محمول کیا جائے، وہ معنیٰ ظاہر جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، جس میں کسی قسم کی تحریف، تعطیل، تکییف یا تمثیل کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ یہ

ان لوگوں کا اجماع ہے جن کا خیر القرون ہونا نبی ﷺ کے بیان سے منصوص ہے، جن کے اجماع کو لازمی حجت قرار دیا گیا ہے، بلکہ ان کے اجماع کا حجت ہونا کتاب وسنت کا مطلوب ومقتضی ہے۔نصوصِ صفات کے قواعد کی بحث کے قاعدہ نمبر۴ میں اس اجماع کی نقل پیش کی جا چکی ہے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ امام ابوالحسن الاشعری اور دیگر ائمہ مسلمین میں سے کوئی بھی اپنی ذات کے بارہ میں معصوم عن الخطأ ہونے کا دعویدار نہیں ہے، انہیں امامتِ دین کا شرف ومرتبہ تب ہی حاصل ہوا جب انہوں نے اپنے نفوس کی قدر پہچانی اور انہیں جائز وصحیح مقام پر (بلا افراط وتفریط) قائم وفائز رکھا۔

ان کے دلوں میں کتاب وسنت کی صحیح تعظیم تھی جس کی بناء پر وہ شرفِ امامت کے مستحق بن گئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ﴾ (السجدة:۲۴)

ترجمہ: (اور ہم نے ان میں سے، چونکہ ان لوگوں نے صبر کیا تھا ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کو ہدایت کرتے تھے)

اللہ تعالیٰ نے ابراھیم علیہ السلام کے بارہ میں فرمایا: ﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ . شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾ (النحل:۱۲۰،۱۲۱)

ترجمہ: (بیشک ابراھیم پیشوا اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور یک طرفہ مخلص تھے، وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا برگزیدہ کر لیا تھا اور انہیں راہِ راست سجھا دی تھی)

واضح ہو کہ متأخرین اشاعرہ جو امام ابوالحسن الاشعری کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے ہیں وہ ان کی صحیح معنی میں اقتداء کا حق ادا نہ کر سکے، چنانچہ عقیدہ کے باب میں، ابوالحسن الاشعری

کی زندگی تین مراحل میں تقسیم ہوتی ہے:

(۱) پہلا مرحلہ: مرحلۂ اعتزال ہے، انہوں نے چالیس سال معتزلہ کا مذہب اپنائے رکھا، اسے بڑی شد و مد سے پیش کرتے، اور اس کے اثبات کیلئے مناظرے کرتے، پھر مذہبِ معتزلہ سے رجوع کر لیا، اور بڑی صراحت سے ان کے گمراہ ہونے کا فتویٰ دیا، اور اسی شد و مد سے ان کی تردید و تفنید شروع کر دی۔

(۲) دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ خالص اعتزال اور خالص سنت کے بیچ بیچ ایک راہ اپنا لی، یہ ابو محمد عبداللہ بن سعید بن کلاب کا منہج تھا، جس کے وہ پیروکار بن گئے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۱۶/۴۷۱) میں فرماتے ہیں:

'' ابو الحسن الاشعری اور اس جیسے دیگر لوگ سلفِ صالحین اور جہمیہ کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے کچھ باتیں سلفِ صالحین سے لے لیں، جو صحیح تھیں، اور کچھ عقلی اصول جہمیہ سے لے لئے، جنہیں وہ صحیح سمجھتے رہے، حالانکہ وہ سب باطل اور فاسد تھے۔

(۳) تیسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے کہ وہ باطل منہج سے رجوع کر کے، امام اہل السنۃ امام احمد بن حنبل کے منہج کو سینے سے لگا لیتے ہیں، جو تمام اہل السنۃ اہل الحدیث کا مذہب تھا، چنانچہ وہ خود اپنی کتاب ''الابانۃ عن اصول الدیانۃ'' جو ان کی آخری کتب میں شمار ہوتی ہے کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

'' نبی ﷺ ہمارے پاس کتابِ عزیز لے کر آئے، ایسی کتاب کہ باطل کو نہ اس کے آگے سے، نہ اس کے پیچھے سے حملہ کرنے کی جرأت ہے، وہ اللہ تعالیٰ، حکمت والے، سزاوارِ حمد و ثناء کی کتاب ہے، اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے اولین کے تمام علوم کو جمع فرما دیا ہے، اور دین اور اسکے فرائض کی تکمیل فرما دی، یہی اللہ تعالیٰ کا صراطِ مستقیم ہے اور یہی اس کی مضبوط رسی ہے، جس نے اسے مضبوطی سے تھاما، نجات پا گیا، اور جس نے اس کی مخالفت مول لی گمراہ و برباد ہو گیا، وہ ہمیشہ

جہل کی اتھاہ گہرائیوں اور تاریکیوں میں بھٹکتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں اپنے رسول ﷺ کی سنت پر تمسک واعتصام کا حکم دیا، چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَانَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (حشر:۷)

ترجمہ: (اور تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ)

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو جس طرح اپنی اطاعت پر مامور فرمایا اور اپنی کتاب پر عمل کا حکم دیا اسی طرح اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا بھی حکم دیا، اور آپ کی سنت کے ساتھ تمسک کی دعوت دی، لیکن جن لوگوں پر شقاوت وہلاکت غالب آگئی، اور جنہیں شیطان نے پوری طرح اپنے پنجوں میں جکڑ لیا انہوں نے نبی ﷺ کی سنتوں کو پسِ پشت ڈال دیا، انہوں نے رسول اللہ کی سنتوں کو نہ صرف عملی طور پر ٹھکرایا بلکہ انکار اور جحود وعناد کی روش اپنالی، اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھ کر، اپنے جیسے معاندین وملحدین کے پیروکار بلکہ مقلد بن کر پورے پورے گمراہ ہوگئے، اور ہدایت سے کوسوں دور چلے گئے۔''

اس کے بعد امام ابوالحسن الاشعری رحمہ اللہ نے اہلِ بدعت کے کچھ اصول ذکر فرمائے اور ان کے باطل ہونے کا عندیہ دیا، پھر فرمایا:

''اگر کوئی شخص کہے کہ تم نے معتزلہ، جہمیہ، خوارج، روافض اور مرجۂ سب کے مذہب کا انکار کر دیا، تو اب اپنا مذہب تو پیش کیجئے اور جس دین کو آپ اپناتے ہیں اس کی وضاحت کیجئے، ہم جواب دیں گے: ہمارا عقیدہ ومذہب کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اور صحابہ، تابعین وائمہ اھل الحدیث نے جو کچھ روایت کیا ہے، کے ساتھ تمسک کا ہے، ہم انہیں مضبوطی کے ساتھ تھامنے والے ہیں اور امام ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل، اللہ تعالیٰ ان کے چہرے کو تروتازہ فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور انکو اجرِ عظیم سے نواز دے، کے منہج کے قائل ہیں، اور جو شخص امام احمد بن حنبل کے عقیدہ ومنہج کے مخالف ہے، اس سے کنارہ کشی اختیار کرنے والے ہیں؛ کیونکہ امام احمد

بن حنبل رحمہ اللہ امامِ فاضل اور رئیسِ کامل ہیں۔"

اس کے بعد ابوالحسن الاشعری نے امام احمد بن حنبل کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے جو تائیدِ حق فرمائی اس کی بہت تعریف کی، پھر صفاتِ باری تعالیٰ، مسائل قدر، شفاعت اور بعض دیگر شبہات کا نقلی وعقلی دلائل سے اثبات پیش کیا۔

افسوس کہ متاخرینِ اشاعرہ نے جو ان کی طرف منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں ان کی زندگی کے تین مذکورہ مراحل میں سے دوسرے مرحلہ کو تھام لیا، اور بیشتر صفات میں تاویل کی روش اپنالی، صرف سات صفات کو بلا تاویل مانا (باقی سب میں تاویل کی راہ پر چل نکلے) وہ صفات مندرجہ ذیل شعر میں مذکور ہیں:

حی علیم قدیر والکلام له   إرادة وكذلك السمع والبصر

(یعنی صفتِ حیات، علم، قدرت، کلام، ارادہ، سمع اور بصر)

ان صفات کے اثبات کی کیفیت میں بھی ان کے اور اھل السنۃ کے منہج میں اختلاف پایا جاتا ہے۔"

شیخ السلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۳۵۹/۶) میں اشاعرہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" اشعریہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خبریہ کی نفی کرتے ہیں، البتہ اشاعرہ میں سے وہ لوگ جو "کتاب الدیانة" جو کہ ابوالحسن الأشعری کی آخری عمر کی تالیف ہے اور جس کے مخالف یا مناقض ان کا کوئی مقالہ منظرِ عام پر نہیں آیا، کی بات کرتے ہیں، ان کا یقینی طور پر اُھل السنۃ میں شمار ہوگا۔"

اس سے قبل شیخ الاسلام نے (ص: ۳۱۰) میں فرمایا تھا:

"اُشعریہ (جن کا عقیدہ اھل السنۃ کے برعکس ہے) کا صفاتِ باری تعالیٰ کے بارہ میں مذہب

تعطیل کو مسلتزم ہے، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ عالم کے اندر ہے نہ باہر۔"

(وہ کہتے ہیں) اللہ تعالیٰ کے پورے کلام کا ایک ہی معنی ہے جس کی رو سے آیت الکرسی اور آیۃ الدَین (قرضہ کے احکام والی آیت) اور توراۃ وانجیل سب کا ایک معنی ہے......اس عقیدے کا فاسد ہونا بداھۃً وظاہراً معلوم ہے۔

شیخ الاسلام کے شاگرد حافظ ابن القیم رحمہ اللہ قصیدۂ نونیہ (ص:۳۱۲) میں فرماتے ہیں:

واعلم بأن طریقهم عکس الطریق المستقیم لمن له عینان

جان لو کہ اشاعرہ کا منہج أھل السنۃ کے منہجِ مستقیم کے بالکل برعکس ہے، کھلی آنکھوں سے دیکھنے والا اس حقیقت کو بخوبی سمجھتا ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

فاعجب لعمیان البصائر أبصروا کون المقلد صاحب البرهان

ورأوه بالتقلید أولی من سواه بغیر مابصرو لابرهان

وعموا عن الوحیین إذ لم یفهموا معناهما عجبا لذی الحرمان

ترجمہ: بصیرت کے اندھوں پر تعجب ہے کہ وہ مقلد کو صاحبِ دلیل قرار دیتے ہیں، اور وہ بلاغور وفکر اور بلا دلیل، مقلد کو بوجہ تقلید دوسروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ دونوں وحیوں (قرآن وحدیث) سے بالکل اندھے ہیں؛ کیونکہ وہ ان کا معنی سمجھنے سے قاصر ہیں، تو اس محرومِ ہدایت شخص پر تعجب ہے۔

الشیخ محمد أمین الشنقیطی اضواء البیان (۳۱۹/۲) میں سورۂ الاعراف کی آیت مبارکہ جس میں اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا ذکر ہے کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"جان لو کہ اس معاملہ میں متأخرین میں سے بے شمار لوگ بہت بڑی غلطی کا شکار ہوگئے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً: استواء علی العرش یا الید (ہاتھ) وغیرہ کا جو معنیٰ ظاہر، متبادر

الی الذہن ہے،اس کو مان لینے سے مخلوقات سے تشبیہ لازم آتی ہے،لہذا ان نصوص کو ان کے معنیٰ ظاہر سے اجماعاً پھیرنا فرض ہوا۔

(شیخ فرماتے ہیں:) اب آپ غور کریں کہ ان کے اس قول سے کیا لازم آرہا ہے؟اس قول سے لازم آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس کے اندر جو اپنی صفات بیان فرمائی ہیں ان کا ظاہری معنی کفر پر مشتمل ہے،ان کے معنیٰ متبادر الی الفھم کا مطلب یہ ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ صفات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بارہ میں خود بیان فرمائی ہیں،اللہ تعالیٰ کے لائقِ شان نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے پیغمبر ﷺ کا منصب یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴)

ترجمہ: (یہ ذکر (کتاب) ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے کہ لوگوں کی جانب جو نازل کیا گیا ہے،آپ اسے کھول کھول کر بیان کردیں)

چنانچہ نبی ﷺ نے نصوصِ صفات کے بارہ میں کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ان کا معنیٰ ظاہر،ومتبادر الی الذہن،کفر وضلال پر مشتمل ہے، بلکہ اس سلسلہ میں نبی ﷺ سے ایک حرف بھی منقول نہیں ہے، اور یہ بات ناممکن ہے کہ آپ ﷺ بوقتِ ضرورت خاموش رہیں اور وہ بھی عقیدہ کے بارہ میں؟؟

افسوس کہ متاخرین میں سے یہ جاہل لوگ رونما ہوئے جو گویا زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی صفات بیان فرمائی ہیں ان کا ظاہری معنی،اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں،اور یہ نکتہ (نعوذ باللہ) نبی ﷺ نے بھی اپنی امت سے چھپایا،لہذا ہمارے لیئے ضروری ہے کہ ہم تاویلوں کے ذریعے ان نصوص کے معنیٰ ظاہر کو پھیر دیں۔ یہ ساری باتیں کتاب وسنت سے بالکل منحرف ہوکر ان کی ذاتی خواہشات ومیلانات پر مبنی ہیں۔

اے اللہ تو پاک ہے، یہ بہتانِ عظیم ہے،ان کی یہ باتیں سب سے بڑی گمراہی،اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر سب سے بڑا افتراء ہے۔

قارئین کرام! حق بات، جس میں تھوڑی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی ذرہ برابر شک نہیں کرسکتا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر وہ صفت جو اللہ تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمادی، وہ اپنے معنیٰ ظاہر، متبادر الی الذہن سے ثابت ہے، اور جس شخص کے دل میں ایمان کی رمق بھی پائی جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے بارہ میں مخلوقات سے مشابہت کا عقیدہ نہیں رکھ سکتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو تشبہ بالمخلوقات سے کلی طور پر منزہ سمجھے گا۔

(شیخ شنقیطی مزید فرماتے ہیں) بھلا ایک عاقل اس حقیقت کا انکار کرسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے حوالے سے جو کچھ شریعت میں وارد ہوا ہے اس کا معنیٰ متبادر الی الذہن یا معنیٰ سابق فی الذہن، خالق اور مخلوق کے مابین پوری منافات پر قائم ہے (نہ کہ تشبیہ پر) اس حقیقت کا انکار وہی شخص کرسکتا ہے جس کا دل کبر وعناد سے لبریز ہو۔

ایک جاہل ومفتری انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی آیات کا جو معنیٰ ظاہر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لائق ہی نہیں؛ کیونکہ وہ کفر وتشبیہ پر منتج ہوتا ہے، اب تشبیہ کی اس گندگی نے (جو اس کی اپنی پیدا کردہ ہے) اس کے دل کو نجس وناپاک کردیا، اور پھر تشبیہ کی نحوست نے اسے صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی وانکار پر مجبور کردیا حالانکہ ان صفات کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیئے بیان فرمایا ہے

اب یہ جاہل انسان پہلے مشبہ بنا، اور پھر معطل (صفات کا انکار کرنے والا) بن گیا، اور نتیجۃً وہ خود اس عقیدے کا مرتکب ہوگیا جو اول تا آخر کسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لائق نہیں ہے۔ اور اگر اس کا دل کما حقہ اللہ تعالیٰ کی معرفت پر قائم ہوتا، اور کما حقہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا حامل ہوتا، اور اسکے ساتھ ساتھ تشبیہ کی گندگیوں اور غلاظتوں سے پاک ہوتا تو قرآن وحدیث میں اللہ رب العزت کی بیان کردہ صفات کو پڑھ کر اس کے دل ودماغ میں یہی پاکیزہ تصور پیدا ہوتا کہ یہ صفاتِ باری تعالیٰ جو کمال وجلال کا انتہائی عظیم الشان مظہر ہیں، مشابہت مع المخلوقات کے تمام اوہام وعلائق سے پاک ومنزہ ہیں۔ نتیجۃً اس کا دل ان صفاتِ کمال وجلال پر بلا تشبیہ وتاویل ایمان

لانے پر مستعد ہوتا، ایسا ایمان جو اللہ رب العزت کے شایانِ شان ہے، جس کی اساس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: (اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ خوب سننے اور دیکھنے والا ہے)

(شیخ شنقیطی رحمہ اللہ کا کلام ختم ہوا)

واضح ہوا کہ امام ابوالحسن الأشعری رحمہ اللہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں اہل السنۃ، اھل الحدیث کا مذہب اختیار کر چکے تھے، جس کا ملخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو جو صفات خود یا اپنے نبی ﷺ کی زبان سے بیان فرمائیں وہ تمام کی تمام اللہ رب العزت کیلئے بلاتحریف، بلاتعطیل، بلاتکییف، اور بلاتمثیل ثابت ہیں۔ اور انسان کا وہی مذہب معتبر ہے جس کا وہ سب سے آخر میں بالحصر اقرار واثبات کرے، چنانچہ ابوالحسن الأشعری کی کتاب ''الابانۃ'' جو ان کی زندگی کی آخری کتاب شمار ہوتی ہے، میں اسی عقیدہ کی صراحت موجود ہے۔

لہذا اب اگر کوئی شخص ان کی تقلید کا مدعی یا طالب ہے تو اس پر واضح ہونا چاہیئے کہ انکی تقلید کی تکمیل انکے اس مذہب کی اتباع پر قائم ہے جسے انہوں نے اپنی زندگی میں سب سے آخر میں اپنایا اور بصراحت لکھا، اور وہ مذہب، مذہبِ اھل الحدیث ہے، یہی مذہب صحیح اور واجب الاتباع ہے اور اسی مذہب کو امام ابوالحسن الأشعری نے بالالتزام اختیار کرلیا۔ (فرحمه الله رحمة واسعة)

اب تیسرے سوال کے جواب کی طرف آتے ہیں۔ (سوال یہ تھا کہ اشاعرہ کیسے باطل ہوسکتے ہیں، حالانکہ ان میں بڑے بڑے علماء اور معروف دعاۃ موجود ہیں؟) اس کا جواب دو وجوہ سے ہے۔

ایک یہ کہ حق کو شخصیات کے ساتھ نہیں تولا اور پرکھا جاتا، بلکہ شخصیات کو حق کے میزان میں تولا جاتا ہے۔ معرفتِ حق کی یہی صحیح میزان ہے۔ یہ بات درست ہے کہ شخصیتوں کے مقام ومرتبہ کا ان کے اقوال کے قبول کرنے میں ایک اثر ہے، جیسا کہ عادل راوی کی خبر کے قابلِ قبول ہونے

اور فاسق کی خبر کے قابلِ توقف (یا قابلِ رد) ہونے کا قاعدہ موجود ہے، لیکن ہر حال میں اس کو معرفتِ حق کا میزان قرار دینا درست نہیں ہے۔ ہر انسان ایک بشر ہے اور کوئی بشر علمِ کامل اور فہمِ کامل کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس کے فہم وعلم میں اگر بہت نہیں تو کچھ نہ کچھ کمی ضرور ہوگی۔ ایک شخص بعض اوقات دین دار اور صاحبِ خلق ہوتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ ناقص العلم اور ضعیف الفہم بھی ہوتا ہے، لہٰذا اس ضعف اور نقص کے بقدر وہ علمِ صحیح سے خالی یا محروم ہوجاتا ہے۔ یا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی نشو ونما ایک معین مذہب پر ہوتی ہے، وہ دوسرے مذاہب کو جان ہی نہیں پاتا، نتیجۃً یہی سمجھ بیٹھتا ہے کہ حق وثواب اس کے مذہب میں منحصر ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر ہم ان علماء ورجال کا جو اشاعرہ کے مذہب پر قائم تھے، ان علماء ورجال کے ساتھ مقارنہ ومقابلہ کریں جو اہل السنۃ سلف صالحین کے مذہب پر تھے، تو ہم پر یہ بات واضح اور آشکارا ہوگی کہ مذہبِ سلف صالحین کے علماء، مذہبِ اشاعرہ کے علماء سے مقام میں کہیں بڑے، علم میں کہیں برتر، اور ہدایت وطریقِ مستقیم کو اپنانے میں کہیں زیادہ مضبوط ومستحکم تھے۔

چنانچہ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ) جن کی ایک خلقِ عظیم پیروکار ہے، عقیدہ کے باب میں اشاعرہ کے مذہب پر نہیں بلکہ سلف صالحین اھل الحدیث کے مذہب پر تھے۔ اس سے بھی اوپر اگر آپ طبقۂ تابعین پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو ان میں سے کوئی بھی مذہبِ اشاعرہ پر نہیں ملے گا۔ اور اگر اس سے بھی اوپر اصحابِ رسول ﷺ اور خلفاءِ راشدین رضوان اللہ علیھم اجمعین کے زریں اور سنہری دور کو دیکھیں تو اسماء وصفات کے باب میں، ان میں سے کسی کا وہ عقیدہ نہیں جسے اشاعرہ اپنا کر مذہبِ سلف صالحین سے خارج ہوگئے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اشعری مذہب کی طرف منسوب بعض علماء کی اسلام میں اچھی خدمات ہیں، انہوں نے اسلام کا بھرپور دفاع کیا، نیز انہوں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کا روایۃً ودرایۃً اہتمام بھی کیا، وہ مسلمانوں کے نفع وہدایت کے حریص بھی تھے، لیکن یہ

تمام امور قطعاً اس بات کو موجب و مسلتزم نہیں کہ جس مسئلے یا مسائل میں وہ غلطی کر گئے، غلطی کے باوجود انہیں معصوم قرار دے دیا جائے؟ اوران کے ہر قول کو آنکھیں بند کر کے قبول کرلیا جائے؟ اوران کی غلطیوں کو بیان کر کے ان کا رد نہ کیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اخطاء واغلاط کے ذکراور پھر رد میں بیانِ حق اور ہدایت ونصیحتِ خلق کا پہلو موجود ہے۔ جو نہایت ضروری ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ بعض اشعری علماء کی (اختیارِ مذہب کے تعلق سے) نیت انتہائی نیک اور صالح تھی، لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی کا قول قبول کرنے کیلئے محض اس کی نیت کا اچھا ہونا کافی نہیں، بلکہ ضروری ہے کہ وہ قول اللہ تعالیٰ کی شریعت کے بھی موافق ہو۔اگر موافق نہ ہو بلکہ مخالف ہوتو اس کا رد کرنا ضروری ہے ،خواہ اس کا قائل کوئی بھی ہو۔الصادق المصدوق محمد رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:[من عمل عملا ليس عليه أمرنا فهو رد]

[جس شخص نے (خواہ وہ کوئی بھی ہو) کوئی ایسا عمل کیا جسے ہماری تائید وموافقت حاصل نہیں تو وہ مردود ہے]

پھر حسنِ ادب کا تقاضہ یہ ہے کوئی ایسا شخص جو خیر خواہانہ جذبات اور طلبِ حق میں صدق اوراخلاص کے ساتھ معروف ہو،اگر غلطی کر جائے تو اس کے خلاف فتویٰ یا بدکلامی کا محاذ کھولنے کے بجائے اسے معذور قرار دیا جائے (کہ غلطی تو ہر انسان سے ہوسکتی ہے اور معصوم عن الخطأ صرف محمد رسول اللہ ﷺ ہیں) لیکن اگر کوئی بدنیتی مخالفتِ حق اور کبر وعناد میں مشہور ہوتو (احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کیلئے)اس کے ساتھ وہی معاملہ روا رکھا جائے جس کا وہ مستحق ہے۔

ایک انتہائی اہم سوال اوراس کا جواب

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ تم صفاتِ باری تعالیٰ میں تاویلیں کرنے والوں کو کافر کہو گے یا فاسق؟

ہم جواباً عرض کریں گے: کسی کو کافر یا فاسق قرار دینے کا فیصلہ کرنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے،

بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسول ﷺ کے سپرد ہے۔ تکفیر یا تفسیق، احکامِ شرعیہ میں سے ہے جس کا مرجع کتاب وسنت ہے، لہذا اس میں انتہائی درجہ کا تثبت ضروری ہے۔ کسی شخص کو اس وقت تک کافر یا فاسق نہ کہا جائے، جب تک اس کے کفر یا فسق پر قرآن اور حدیث کی دلیل نہ ہو۔

ہر وہ مسلمان جو ظاہر العدالۃ ہو اس کے تعلق سے اصلِ شرعی یہی ہے کہ اس کا مسلمان اور عادل ہونا قائم وبرقرار ہے، لہذا جب تک کسی شرعی دلیل سے ان میں سے کسی چیز کا زائل ہونا معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک ہرگز ہرگز اس کی تکفیر یا تفسیق نہ کی جائے...... تکفیر وتفسیق میں تساھل برتنے والا دو انتہائی خطرناک وعیدوں کا مستحق بن جاتا ہے:

ایک یہ کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہو، اور آپ اس پر کفر کا فتویٰ صادر کر کے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے کے مرتکب ہو جائیں، اس کے ساتھ ساتھ آپ کا فتویٰ شخصِ محکوم علیہ پر بھی بہتان وافتراء قرار پائیگا (جو کبائر میں سے ہے)

دوسری خطرناک وعید یہ ہے کہ کفر یا فسق کا جو حکم آپ نے اپنے بھائی پر لگایا ہے اگر وہ اس سے بری اور محفوظ ہے تو وہ فتویٰ آپ پر لوٹ آئے گا۔

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما ان النبی ﷺ قال: [اذا كفر الرجل أخاه فقد باء بها احدهما] وفی رواية: [ان كان كما قال والا رجعت إليه]

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: [اگر کسی شخص نے اپنے کسی بھائی کو کافر کہا تو دونوں میں سے ایک ضرور کافر ہو جائے گا] ایک روایت میں یوں بھی وارد ہے: [اگر تو وہ اس کے کہنے کے مطابق کافر ہے، تو درست ورنہ وہ کفر کا حکم اس (کہنے والے) پر لوٹ آئے گا] (مسلم مع النووی: ۲/۴۹)

عن ابی ذر رضی اللہ عنه عن النبی ﷺ: [ومن دعا رجلا بالكفر أو قال: عدو الله وليس كذلك الا حار عليه] (مسلم)

ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: [جس نے کسی شخص کو کافر یا اللہ کا دشمن کہا اور وہ ایسا نہیں ہے، تو پھر کہنے والا کافر اور اللہ کا دشمن قرار پائے گا]

لہذا کسی بھی مسلمان پر کفر یا فسق کا فتویٰ لگانے سے قبل دو چیزوں کو دیکھنا ضروری ہے:

☆ ایک یہ کہ قرآن یا حدیث کی نص موجود ہو کہ اس شخص کا کوئی قول یا فعل کفر کو موجب ومستلزم ہے۔

☆ دوسری چیز یہ کہ جس شخصِ معین کو اس کے کسی قول یا فعل کی بنیاد پر کافر یا فاسق کہا جا رہا ہے، اس پر تکفیر یا تفسیق کی تمام شروط واقعتاً منطبق ہو رہی ہیں، نیز یہ کہ تکفیر یا تفسیق کے جو موانع یا جورکاوٹیں ہیں، وہ ان سب کو عبور کر چکا ہے۔

سب سے اہم شرط یہ ہے کہ جس مخالفت کی بناء پر اسے کافر یا فاسق کہا جا رہا ہے، اسے علم ہو کہ یہ مخالفت، کفر یا فسق کو موجب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:۱۱۵)

ترجمہ: (جو شخص باوجود راہِ ہدایت کے واضح ہو جانے کے بھی رسول اللہ ﷺ کا خلاف کرے اور تمام مؤمنوں کی راہ چھوڑ کر چلے، ہم اسے ادھر ہی متوجہ کر دینگے جدھر وہ خود متوجہ ہو اور دوزخ میں ڈال دینگے، وہ پہنچنے کی بہت بُری جگہ ہے)

نیز فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (التوبۃ:۱۱۵،۱۱۶)

ترجمہ: (اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کر کے بعد میں گمراہ کر دے جب تک کہ ان چیزوں کو صاف صاف نہ بتلا دے جن سے وہ بچیں بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی دوست ہے اور نہ کوئی مددگار ہے)

اس لیئے اہلِ علم کا کہنا ہے کہ فرائض کا انکار کرنے والا اگر نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہے تو اسے اس وقت تک کافر نہیں کہا جاسکتا جب تک اسے ان فرائض سے آگاہ کر کے اس پر حجت قائم نہ کر دی جائے۔

کسی پر کفر یا فسق کا حکم لگانے سے مانع یا رکاوٹ یہ ہے کہ کفر یا فسق (کا قول یا فعل) اس سے بلاقصد وارادہ ظاہر ہوا ہو، جس کی بہت سی صورتیں ہیں۔:

☆ ایک یہ کہ اسے کفر یا فسق (کے قول یا فعل) پر مجبور کر دیا جائے، چنانچہ وہ برضا ورغبت اور اطمنانِ قلب کے ساتھ نہیں، بلکہ مجبوری کے عالم میں اس کا مرتکب ہو رہا ہے تو ایسی صورت میں اسے کافر یا فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ (النحل:١٠٦)

ترجمہ: (جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے بجز اس کے جس پر جبر کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر برقرار ہو، مگر جو کوئی کھلے دل سے کفر کرے تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کیلئے بہت بڑا عذاب ہے)

☆ دوسری صورت یہ ہے کہ اس پر ایسی اغلاق کی حالت طاری ہو جائے کہ اسے اپنی بات کا احساس وادراک نہیں ہو رہا، بندہ اس کیفیت سے اس وقت دوچار ہوتا ہے جب وہ شدتِ فرح یا شدتِ غم یا شدتِ خوف وغیرہ کی کیفیت سے دوچار ہو۔ اس کی دلیل صحیح مسلم میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[لله أشد فرحا بتوبة عبده حين يتوب إليه من احدكم كان على راحلته

بارض فلاة فانفلتت منه وعليها طعامه فأيس منهافاتى شجرة فاضطجع فى ظلها قد أيس من راحلته فبينما هو كذلک اذ هو قائمة عنده فأخذ بخطامها ثم قال من شدة الفرح: اللهم انت عبدى وأنا ربک، اخطأ من شدت الفرح]

ترجمہ:[اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے توبہ کرنے کی خوشی اس بندے سے بھی زیادہ ہوتی ہے جو اپنی اونٹنی پر سوار کسی بے آب وگیاہ میدان میں محوِ سفر ہو کہ اچانک اس کی اونٹنی کھو جائے، اب اس اونٹنی پر اس کا کھانا اور پانی ہے، اب وہ تلاشِ بسیار کے بعد مایوس ہو کر کسی درخت کے سائے تلے لیٹ جاتا ہے، وہ اپنی سواری سے پوری طرح مایوس ہو چکا ہے، پھر اچانک نظر اٹھا کر دیکھتا ہے، تو اسے اپنی اونٹنی سامنے کھڑی دکھائی دیتی ہے، وہ دوڑ کر اس کی لگام تھام لیتا ہے اور شدتِ فرح سے اپنی زبان سے یہ جملہ بول جاتا ہے: اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں۔ چنانچہ وہ شدتِ فرح کی بناء پر یہ غلط جملہ بول جاتا ہے]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم (۱۲/۱۸۰) میں فرماتے ہیں:

'' جہاں تک کسی کی تکفیر کا معاملہ ہے، تو اس بارہ میں درست بات یہ ہے کہ امتِ محمد ﷺ کا کوئی فرد اگر حق کی تلاش کی کوشش میں غلطی کر جائے تو اسے کافر نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اس کی غلطی تو قابلِ معافی ہے، لیکن جس شخص پر رسول اللہ ﷺ کا فرمان واضح ہو، وہ ہدایت پا لینے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، اور سبیل المؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور راستہ کا پیروکار بن جاتا ہے تو وہ یقیناً کافر ہے۔ البتہ جو شخص اپنی خواہشات کا پیروکار رہا اور طلبِ حق میں کوتاہی کر جائے اور بلاعلم کوئی بات کہہ جائے تو وہ نافرمان اور گناہگار قرار پائے گا، یہ شخص بعض اوقات فاسق کہلاتا ہے اور بعض اوقات گناہگار تو ہوتا ہے لیکن اسکی نیکیاں گناہوں پر راجح اور غالب ہوتی ہیں۔''

شیخ الاسلام رحمہ اللہ مجموع الفتاویٰ (۲۲۹/۳) میں مزید فرماتے ہیں:

'' میں اور میرے ساتھ مجلس کرنے والے اکثر ساتھی بخوبی جانتے ہیں کہ میں اس بات کا

سب سے بڑا منکر اور مخالف ہوں کہ کسی معین شخص کو کافر، فاسق یا عاصی یعنی نافرمان کہا جائے۔ الاّ یہ کہ یقینی علم ہو جائے کہ اس معین شخص پر کتاب وسنت کی دلیل کی حجت قائم ہو چکی ہے، ایسی دلیل جس کا مخالف کبھی تو کافر ہوتا ہے، کبھی فاسق اور کبھی عاصی۔ اور میں یہ بات بھی ذکر کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کی خطأ کو معاف فرمادیا ہے، خواہ وہ خطأ مسائلِ خبریہ قولیہ سے متعلق ہو یا مسائلِ عملیہ کے۔ (مسائلِ خبریہ کی مثال صفاتِ باری تعالیٰ سے اور مسائلِ عملیہ کی مثال صلاۃ وصیام وغیرہ سے دی جاسکتی ہے)۔ اس قسم کے بہت سے مسائل میں سلف صالحین کا آپس میں نزاع وخلاف موجود اور قائم ہے، لیکن کسی نے کسی کو کبھی کافر، فاسق یا عاصی نہیں کہا۔''

شیخ الاسلام نے اس کی کچھ مثالیں بھی ذکر فرمائیں، پھر فرمایا:

'' میں یہ بھی بیان کرتا رہتا ہوں کہ سلفِ صالحین اور ائمہ کرام کے کلام سے بعض مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی تکفیر بھی منقول ہے، وہ بھی حق ہے، لیکن ضروری ہے کہ تکفیرِ مطلق اور تکفیرِ معین کے فرق کو سمجھا جائے۔''

(مزید فرماتے ہیں): '' تکفیر کا عمل ایک بڑی وعید شمار ہوتا ہے (لہذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے) بعض اوقات ایک شخص کا قول بظاہر رسول اللہ ﷺ کی تکذیب پر منتج ہوتا ہے، لیکن ممکن ہے وہ شخص نیا نیا اسلام میں داخل ہو یا ممکن ہے کہ وہ کسی دور دراز دیہات کا رہنا والا ہو (کہ اس تک وہ علم پہنچا ہی نہ ہو) اب یہ شخص انکار کے باوجود اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جائے گا جب تک اس پر وہ علم پہنچا کر حجت قائم نہ کر لی جائے۔ پھر یہ بھی ہوسکتا ہے ایک شخص نے وہ نصوص سنے ہی نہ ہوں، یا سنے ہوں لیکن وہ اسکے نزدیک ثابت نہ ہوں یا کسی دوسرے معارض کی وجہ سے اس نے کوئی تاویل کر رکھی ہو، خواہ وہ تاویل غلط ہی کیوں نہ ہو۔ میں ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا ذکر کرتا رہتا ہوں جو صحیح بخاری ومسلم میں مروی ہے، جس میں اُس شخص کا قصہ مذکور ہے، جس نے اپنے بیٹوں کو اپنی موت سے قبل لاش کو جلا دینے اور اس کی راکھ کو ہواؤں میں بکھیرنے اور

سمندر کی لہروں کے سپرد کر دینے کی وصیت کی تھی، اس شخص نے یہ الفاظ بھی کہے تھے "اگر اللہ مجھ کو پکڑنے پر قادر ہو گیا تو مجھے ایسا عذاب دے گا جو تمام جہانوں میں سے کسی کو نہیں دیا ہوگا" بیٹوں نے وصیت نافذ کر دی، اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندہ کر کے پوچھا: تم نے جو کچھ کیا اس پر تمہیں کس چیز نے اُبھارا؟ اس نے کہا تیری خشیت نے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرمادیا۔

اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی قدرت پہ شک کیا تھا، وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ جب میں جلا کر، راکھ بنا کر اڑا دیا جاؤنگا تو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ عقیدہ کفر ہے، جس کے کفر ہونے پر مسلمانوں کا اجماع ہے، لیکن یہ شخص جاہل تھا، اور اس مسئلہ کا علم نہیں رکھتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ مؤمن تھا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف میں مبتلا تھا، لہذا اللہ تعالیٰ نے اسے معاف فرمادیا۔

تو پھر وہ شخص جو کسی مسئلہ میں متأول ہے، (خواہ وہ تاویل غلط ہی کیوں نہ ہو) دین میں نیک نیتی سے اجتہاد کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی متابعت پر حریص بھی ہے، وہ اس جلائے جانے والے انسان کی بہ نسبت زیادہ معافی و مغفرت کا مستحق ہے۔"

اس تقریر سے قول اور قائل اور فعل اور فاعل کے مابین فرق واضح ہو گیا، چنانچہ ہر قول یا فعل، کفر یا فسق نہیں ہوتا کہ جس کے قائل یا فاعل پر کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے مجموع الفتاویٰ (۱۶۵/۳۵) میں فرمایا ہے: " اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ مقالہ جس کا کتاب وسنت اور اجماعِ امت سے کفر ہونا ثابت ہو جائے، اس مقالہ کے بارہ میں کہا جائے گا کہ یہ دلائلِ شرعیہ کی روشنی میں کلمۂ کفر ہے (نہ کہ اس کے قائل کو کافر کہا جائے گا) کیونکہ کسی بھی شخص کا ایمان ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ثبوت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے فرامین سے ہوتا ہے، تو پھر دوسرے لوگوں کو کیا حق ہے کہ وہ محض اپنے ظنون یا خواہشات ومیلانات کی روشنی میں اس شخص کے کفر کا حکم لگاتے پھریں..... لہذا یہ بات ضروری نہیں کہ اس مقالۂ کفر کے کہنے والے ہر شخص کی تکفیر کر دی جائے، جب تک اس کے حق میں شروطِ تکفیر ثابت نہ

ہوجائیں، اور موانعِ تکفیر منتفی یا زائل نہ ہوجائیں۔ جیسے ایک شخص شراب یا سود کو حلال کہتا ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ یا تو وہ نیا نیا مسلمان ہوا ہے، یا کسی دور دراز دیہات میں رہنے کی وجہ سے وہ اس مسئلہ سے ناواقف اور نا آشنا ہے، یا مسئلہ تو اس تک پہنچا لیکن اس کا قرآن وحدیث سے ثابت ہونا اسے معلوم نہ ہوا ہو...... تو ایسے شخص کو اس وقت تک کافر قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک اس پر حجت بالرسالۃ قائم نہ ہوجائے، جس کا اس آیتِ کریمہ میں ذکر ہے:

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ (النساء:۱۶۵)

ترجمہ: (تاکہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر رہ نہ جائے)

جبکہ یہ بات بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کے خطأ ونسیان کو معاف فرما دیا ہے۔

ثابت ہوا کہ بعض اوقات ایک قول یا عمل کفر یا فسق ہوتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کا کہنے یا کرنے والا کافر یا فاسق ہو۔ یا تو اس لیئے کہ اس کی تکفیر یا تفسیق کی شرط موجود نہیں، یا کوئی ایسا شرعی عذر موجود ہے جو اس کے کافر یا فاسق ہونے کو مانع ہے۔

لیکن جس شخص پر حق واضح ہوجائے، لیکن وہ اپنے مذہب کی پیروی یا اپنے لیڈر یا امام کی تقلید یا دنیا کی کسی اور وجہِ ترجیح کی بناء پر اس کی مخالفت وانکار پر مصر ہے۔ تو یہ شخص اس حکم کا مستحق بن جاتا ہے، جس کا وہ قول یا فعل متقاضی ہے، خواہ وہ کفر ہو یا فسق۔

لہٰذا ایک مؤمن پر یہ بات فرض اور متعین ہے کہ وہ اپنے ہر عقیدہ وعمل کی اساس کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ ﷺ کو قرار دے دے۔ کتاب وسنت کو اپنا ایسا امام ومقتدیٰ تسلیم کرلے کہ انہی کے نور سے ہمیشہ روشنی حاصل کرے، اور انہی کے طریق ومنہاج پر پوری زندگی چلتا رہے۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جسے اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:۔

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام:۱۵۳)

ترجمہ: (اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے سو اس راہ پہ چلو اور دوسری راہوں پہ مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو)

اس کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے مسلک سے ڈرتا اور بچتا رہے جو کسی مذہب معین کو اپنے ہر عقیدہ وعمل کی اساس قرار دیتے ہیں، اور جب کتاب وسنت کے نصوص کو اپنے مذہب کے خلاف پاتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان نصوص کو من مانی تاویلیں کر کے مطابق مذہب بنالیں۔ اور اس سلسلہ میں ظلم، عناد اور تعصب پرمبنی ایسی تاویلیں کر جاتے ہیں، کہ قرآن وحدیث گویا تابع ہیں نہ کہ متبوع، اور اقوالِ مذہب، امام ومقتدیٰ ہیں نہ کہ تابع۔ (ولاحول ولاقوۃ الا باللہ)

یہ طریق اور منہج ان لوگوں کا ہے جو ذاتی خواہشات کے غلام ہیں، نہ کہ ان کا جو اخلاص کے ساتھ ہدایت کے پیروکار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس منہج کی شدید مذمت فرمائی:

﴿وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ بَلْ أَتَيْنٰهُمْ بِذِكْرِهِمْ فَهُمْ عَنْ ذِكْرِهِمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ (المؤمنون:۷۱)

ترجمہ: (اگر حق ہی ان کی خواہشوں کا پیرو ہو جائے تو زمین وآسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز درھم برھم ہو جائے۔ حق تو یہ ہے کہ ہم نے انہیں ان کی نصیحت پہنچادی ہے لیکن وہ اپنی نصیحت سے منہ موڑنے والے ہیں)

من مانی خواہشات کے پیروکاران لوگوں کے مذاہب ومسالک دیکھنے والے شخص پر ان کے بڑے عجیب وغریب حقائق منکشف ہوتے ہیں، پھر وہ بڑی شدت والحاح سے اپنے پروردگار کی طرف رجوع اختیار کر کے، گڑگڑا گڑگڑا کر اپنی ہدایت اور اس پر ثابت قدمی کی دعا کرتا ہے، نیز ہر گمراہی اور الحاد وانحراف سے اللہ تعالیٰ کی پناہ کا سوال کرتا رہتا ہے،......اور جو شخص صدق واخلاص کے ساتھ یہ سوچ کر دعائیں کرے کہ میرا پروردگار تو بے پرواہ وبے نیاز ہے، میں ہی

اس کے در کا محتاج، مفتقر اور بھکاری ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرمالیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَادَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾ (البقرۃ:۱۸۶)

ترجمہ: (جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں، ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ مجھے پکارے، قبول کرتا ہوں اس لیئے لوگوں کو بھی چاہیئے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان رکھیں، یہی ان کی بھلائی کا باعث ہے)

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس زمرے میں شامل فرمالے جو حق کا حق ہونا جانتے ہیں اور پورے اخلاص سے اس کی پیروی کرتے ہیں اور باطل کا باطل ہونا جانتے ہیں اور پوری شدومد سے اس سے اجتناب کرتے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت یافتہ اور ہدایت دینے والا بنادے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہمیں اپنی اور پھر دوسروں کی اصلاح کی توفیق عطا فرمادے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو ہدایت کے بعد کجرو اور ٹیڑھا نہ کردے۔ اور ہمیں اپنی بھرپور رحمت عطا فرمادے کہ وہی عطا فرمانے والا ہے۔

تمام تعریفیں اللہ رب العالمین کیلئے ہیں کہ جس کی توفیق واحسان سے نیک اور اچھی چیزیں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ پر درود وسلام کی موسلا دھار بارش برسادے کہ جو سراسر رحمت ہیں اور اُمت کو اللہ تعالیٰ کے اذن سے صراطِ مستقیم کا راستہ دکھانے والے ہیں، نیز اللہ تعالیٰ آپ کی آل واصحاب اور قیامت تک ان کے بہترین پیرکاروں پر بھی رحمتیں اور سلامتیاں نازل فرمائے۔ (آمین)

(شوال کی پندرہ تاریخ ۱۴۰۴ھ میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت

کے متعلق شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کے اس مقالے کا مکمل متن جو مجلۃ الدعوۃ سعودی عرب میں شائع ہوا

شمارہ نمبر (۹۱۱) تاریخِ اشاعت ۴/۱/ ۱۴۰۴ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونتوب إليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا، من يهده الله فلامضل له ومن يضلل فلاهادي له، وأشهد ان لااله الا الله وحده لاشريك له، وأشهد ان محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وسلم وعلى آله وأصحابه ومن تبعهم باحسان وسلم تسليما.

ہم نے اپنی ایک مجلس میں اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کا معنی ومفہوم ذکر کیا تھا، جسے بعض لوگ ہمارے مقصود ومراد، اور ہمارے عقیدے کے بالکل خلاف سمجھ بیٹھے، نتیجۃً لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے بارہ میں بہت زیادہ استفسار شروع کر دیا۔ ہم نے یہ سوچ کر:

☆ کوئی شخص ہماری گفتگو سے غلط معنی اخذ کر کے اللہ تعالیٰ کی صفتِ معیت کے متعلق ایسا عقیدہ نہ اپنالے جو اس کی شان کے لائق نہ ہو۔

☆ نیز کوئی شخص ہماری طرف صفتِ معیت کے حوالے سے ایسی بات نہ منسوب کردے جو ہم نے کہی ہی نہیں، یا کوئی شخص ہماری اس گفتگو کے حوالے سے ایسے وہم کا شکار نہ ہوجائے جو قطعی ہمارا مقصود نہ ہو۔

☆ نیز اس صفتِ عظیمہ جس کا قرآنِ حکیم کی متعدد آیات اور رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث میں ذکر موجود ہے، کا صحیح معنی بیان کرنے کیلئے،

ہم درج ذیل امور بیان کرتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت (یعنی خلق کے ساتھ ہونا) کتاب وسنت اور اجماعِ

سلف سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿إِنَّ اللهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّالَّذِينَ هُمْ مُّحْسِنُونَ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کے ساتھ ہے) (النحل:۱۲۸)

جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو فرمایا:

﴿لا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرٰى﴾ (طٰہٰ:۴۶)

ترجمہ: (تم مطلقاً خوف نہ کرو، میں اب تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہوں گا)

اپنے پیغمبر محمد ﷺ کے متعلق (جبکہ وہ غار میں تھے،) فرمایا:

﴿إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللهَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ: (اگر تم ان کی مدد نہ کرو تو اللہ ہی نے ان کی مدد کی، اس وقت جب کہ اسے کافروں نے (دیس سے) نکال دیا تھا، دو میں سے دوسرا جبکہ وہ غار میں تھے، جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [افضل الایمان ان تعلم ان اللہ معک حیثما کنت]

ترجمہ: [افضل ایمان یہ ہے کہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہو کہ تم جہاں بھی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے]

اس حدیث کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے العقیدۃ الواسطیۃ کے اندر حسن قرار دیا ہے، جبکہ بعض اہلِ علم سے اس کا ضعیف ہونا مذکور ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ کے متعلق اپنی معیت کے اثبات کے حوالے سے فرمان پیچھے گزر چکا ہے۔

اس کے علاوہ سلف صالحین کا اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کے اثبات پر اجماع قائم ہے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معیت حق ہے اور اپنی حقیقت پر قائم ہے، ایسی حقیقت جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے، جو ہر مخلوق کی تشبیہ سے پاک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿لَيۡسَ كَمِثۡلِهٖ شَىۡءٌ‌ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡبَصِيۡرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

ترجمہ: (اس جیسی کوئی چیز نہیں، اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا﴾ (مریم:۶۵)

ترجمہ: (کیا تیرے علم میں اس کا ہم نام اور بھی ہے)

نیز فرمایا: ﴿وَلَمۡ يَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ (اخلاص:۴) ترجمہ: (اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے)

الغرض، جس طرح اللہ رب العزت کی دیگر تمام صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کیلئے ایسی حقیقت کے ساتھ ثابت ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان ہے، اور وہ صفات، مخلوقات کی صفات کے قطعاً مشابہ نہیں (اسی طرح صفتِ معیت کے حوالے سے ہمارا عقیدہ ہے)

حافظ ابن عبد البر فرماتے ہیں: اہل السنۃ کا اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات جو قرآن وسنت میں وارد ہوئی ہیں کے اثبات پر اجماع ثابت ہے، اسی طرح ان پر ایمان لانے، اور انہیں مجاز کے بجائے حقیقت پر محمول کرنے پر بھی اجماع ثابت ہے۔ اہل السنۃ نہ تو کسی صفت کی تکییف کرتے ہیں، نہ کسی صفت کو حد میں محدود کرتے ہیں۔

ابن عبد البر کے اس قول کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتویٰ الحمویۃ (۸۷/۵) میں نقل فرمایا ہے۔

شیخ الاسلام الفتویٰ الحمویۃ (۱۰۲/۵) میں فرماتے ہیں:

" کوئی شخص کتاب وسنت میں وارد ہونے والی اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارہ میں یہ نہ سمجھے کہ

ان میں آپس میں تناقض وتعارض پایا جاتا ہےاوراس کی مثال یہ پیش کرے کہ قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کی صفت ''استواء علی العرش '' اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکور صفتِ معیت کے خلاف ہے: ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾ (تم جہاں بھی ہووہ تمہارے ساتھ ہے)

اسی طرح اس حدیث کے بھی خلاف ہے:

[اذاقام احدکم الی الصلاۃ فان اللہ قبل وجھہ]

ترجمہ:[جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتو اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کے سامنے ہوتا ہے]

ان نصوص میں تناقض کا دعویٰ غلط ہے۔اللہ تعالیٰ کا ہمارے ساتھ ہونا بھی حقیقت ہے اور اس کا عرش پر مستوی ہونا بھی حقیقت ہے،اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حقیقتوں کو اپنے اس فرمان میں جمع فرمادیا:

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ فِى سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوىٰ عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَايَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَايَخْرُجُ مِنْهَا وَمَايَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَايَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَاكُنْتُمْ وَاللهُ بِمَاتَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ:(وہی ہے جس نے آسمانوں اورزمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھرعرش پر مستوی ہوگیا،وہ خوب جانتا ہےاس چیز کو جوزمین میں جائے اور جواس سے نکلےاور جوآسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کراس میں جائے،اور جہاں کہیں تم ہووہ تمہارے ساتھ ہےاور جوتم کررہے ہواللہ دیکھ رہاہے)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خبردی ہے کہ وہ اپنے عرش کےاوپر ہے،کائنات کی ہر چیز کوجانتا ہے،اور ہم جہاں بھی ہوں وہ ہمارے ساتھ ہے۔یہی بات حدیث الاوعال میں مذکور ہے[واللہ فوق العرش وھو یعلم ما أنتم علیہ]یعنی (اللہ تعالیٰ عرش پر ہےاورتمہارے ہر معاملے کوجانتا ہے)

اس کی تفصیل یوں ہے کہ لغتِ عربیہ میں'' لفظ''مـــع ''یعنی (ساتھ ہونا) جب استعمال کیا جائے گا تو لغت میں اس کا ظاہری معنی مطلقاً مقارنت ومصاحبت ہی ہوگا،معیت کے معنی میں چھونا یادائیں بائیں موجود ہونا ضروری نہیں ہے۔جب سیاقِ کلام کے پیشِ نظر''مع'' کے کسی معنی کومقید کیا جائے گا تو اسی معنی کی مقارنت مراد ہوگی۔

کہاجاتا ہے:''مازلنا نسير والقمر معنا او النجم معنا ''ہم چلتے رہےاور چاند ہمارے ساتھ رہا،یافلاں ستارہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا۔اسی طرح اپنا سامان اگرچہ آپ نے اپنے سر کے اوپراٹھار کھا ہومگرآپ کہتے ہیں:''هذا المتاع معی ''(یہ سامان میرے ساتھ ہے)

لہٰذا اللہ تعالیٰ حقیقتاً اپنی خلق کے ساتھ بھی ہےاور حقیقتاً اپنے عرش کےاوپر بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی خلق کے ساتھ معیت کی حقیقت اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ اپنی خلق کا از روئے علم،قدرت،سمع،بصر،غلبہ،تدبیراور دیگر تمام معانی ربوبیت کے ساتھ احاطہ کیئے ہوئے ہے......اب یہ معیت اگر سیاقِ عموم میں مذکور ہےتو اس سے کوئی شخص یا وصف مستثنیٰ نہیں ہوگا، بلکہ وہ پوری مخلوق کے ساتھ ہر حال میں ہوگی۔جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ﴾(الحدید:۴)

ترجمہ:(اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

اسی معیتِ عامہ پر مشتمل ہے۔جس کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے،تم جہاں بھی ہو......اس سے کوئی فرد،یا اس کی کوئی حالت مخصوص یا مستثنیٰ نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی یہی معیتِ عامہ مذکور ہے:

﴿مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلاثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا﴾(المجادلۃ:۷)

ترجمہ:(تین آدمیوں کی سرگوشی نہیں ہوتی مگر اللہ ان کا چوتھا ہوتا ہےاور نہ پانچ مگر ان کا چھٹا

وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم کا اور نہ زیادہ کا مگر وہ ساتھ ہی ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں)

اور اگر صفتِ معیت کا سیاقِ خاص میں ذکر ہے، مثلاً: کسی شخص یا وصف کے ساتھ معیت کو مخصوص کیا گیا ہے تو یہ معیتِ خاصہ کہلاتی ہے، جس میں علم واحاطہ کے معنی کے ساتھ ساتھ ایک اضافی معنی بھی پیدا ہو جائے گا اور وہ ہے مدد کرنا، تائید فرمانا، ہدایت وتوفیق عطا فرمانا وغیرہ۔

کسی شخص کے ساتھ مخصوص معیت کی مثال، اللہ تعالیٰ کا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمانا:

﴿ اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَأَرٰی﴾ (طٰہٰ:۴۶)

ترجمہ: (میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہونگا)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا محمد ﷺ کے متعلق فرمان ہے:

﴿اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا﴾ (التوبۃ:۴۰)

ترجمہ: (جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے)

(ان دونوں آیتوں میں معیتِ خاصہ کا ذکر ہے، جس میں اضافی طور پر نصرت وتائید کا معنی موجود ہے۔)

کسی وصف کے ساتھ مخصوص معیت کی مثال، اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ﴾ (الانفال:۴۶)

ترجمہ: (صبر کرو! بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

قرآنِ حکیم میں اس قسم کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ مجموع الفتاویٰ لابن القاسم کے الفتاویٰ الحمویۃ (۱۰۳/۵) میں فرماتے ہیں:

’’ حسبِ مقام، معیت کے احکام ومعانی مختلف ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یَعْلَمُ مَایَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَایَخْرُجُ مِنْھَا وَمَایَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَایَعْرُجُ فِیْھَا وَھُوَ مَعَکُمْ أَیْنَ مَاکُنْتُمْ﴾ (الحدید:۴)

ترجمہ: (وہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں جائے اور جو اس سے نکلے اور جو آسمان سے نیچے آئے اور جو کچھ چڑھ کر اس میں جائے، اور جہاں کہیں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے)

اس آیت کا ظاہر دلالت کر رہا ہے کہ یہاں معیت کا حکم، مقتضیٰ یا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر مطلع ہے، گواہ ہے، تمہیں جانتا ہے، اور تمہارا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔

سلفِ صالحین کا ''وھو معکم'' کی تفسیر میں ''معھم بعلمہ'' (وہ اپنے علم کے اعتبار سے ان کے ساتھ ہے۔) کا یہی معنی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں صفتِ معیت کا یہی ظاہر و حقیقت ہے۔

جب نبی ﷺ نے غار کے اندر اپنے دوست سے کہا: ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (پریشان نہ ہو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے)

تو یہاں بھی معیت اپنی حقیقت وظاہر پر قائم ہے، آیت کا سیاق یہ دلالت کر رہا ہے کہ یہاں معیت، اطلاع کے معنی کے ساتھ ساتھ، نصرت و تائید کے معنی پر بھی مشتمل ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی معیت کے معنی میں نصرت و تائید کا مفہوم شامل ہے

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے) (النحل: ۱۲۸)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے فرمانا:

﴿اِنَّنِیْ مَعَکُمَا اَسْمَعُ وَاَرٰی﴾ (طہٰ: ۴۶)

ترجمہ: (میں تمہارے ساتھ ہوں اور سنتا دیکھتا رہوں گا)

یہاں بھی معیت کا ظاہری معنی علم واحاطہ کے ساتھ ساتھ نصرت و تائید ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ آگے مزید فرماتے ہیں: ''معیت کے معنی و مقتضیٰ میں فرق موجود ہے، بعض اوقات سیاقِ کلام کے مطابق معیت کا جو مقتضیٰ ہوتا ہے وہی اس کا معنی ہوتا ہے، لہذا

سیاقِ کلام کی مناسبت سے معانی مختلف ہو سکتے ہیں۔''

محمد بن الموصلی اپنی کتاب'' استعجال الصواعق المرسلة علی الجهمية والمعطلة لابن القيم'' کی مثال نمبر۹ اور ص۴۰۹ میں فرماتے ہیں:

'' لفظِ'' مع '' کے تعلق سے غایتِ کلام یہ ہے کہ یہ کسی بھی امر میں مصاحبت، مقارنت اور موافقت پر دلالت کرتا ہے، اور ہر مقام پر سیاقِ عبارت کی روشنی میں اس مقارنت کا حسبِ مقام معنی متعین ہوگا۔ جب یہ کہا جائے'' اللہ مع خلقه ''یعنی اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ساتھ ہے، تو یہ عموم ہے جس کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جانتا ہے، ان پر قدرت رکھتا ہے، اور ان کے جملہ امور کی تدبیر فرماتا ہے، لیکن جب لفظِ'' مع '' کا ذکر مخصوص پیرائے میں ہوگا جیسے قولہ تعالیٰ:

﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ﴾

ترجمہ: (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے) (النحل:۱۲۸)

تو یہاں مقارنت کے ساتھ ساتھ نصرت، تائید اور معونت کا معنی بھی لازماً شامل ہوگا۔

ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی بندوں کے ساتھ معیت دو قسم کی ہے، ایک معیتِ عامہ اور دوسری معیتِ خاصہ۔ قرآن حکیم نے معیت کی ان دونوں قسموں کو ذکر کیا ہے، محض لفظی اشتراک کے طور پر نہیں، بلکہ معیت وصحبت کی جو حقیقت اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہے، اسی حقیقت کے ساتھ۔''

حافظ ابن رجب رحمہ اللہ نے'' الاربعين النووية '' کی ۲۹ ویں حدیث کی شرح کے ضمن میں فرمایا ہے:'' اللہ تعالیٰ کی معیتِ خاصہ، نصرت، تائید، حفاظت واعانت کی متقاضی ہے، جبکہ معیتِ عامہ، اللہ تعالیٰ کا بندوں پر علم واحاطہ اور انکے تمام اعمال کی مکمل نگرانی کی متقاضی ہے''

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ سورۃ المجادلۃ کی آیتِ معیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

'' بہت سے علماء نے اجماع نقل کیا ہے کہ یہاں معیت سے مراد معیتِ علم واحاطہ ہے

اور بلاشبہ یہ مراد لینا محمول برحقیقت ہے۔اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی ہر بات سنتا اور ہر چیز دیکھتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی خلق کے تمام احوال وامور پر پوری طرح مطلع ہے اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں''

(۴) اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق ، کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق کے ساتھ مختلط یا ان میں حلول کیئے ہوئے ہے،صفتِ معیت کا یہ معنیٰ چونکہ اللہ تعالیٰ کے حق میں باطل اور ناممکن ہے،لہذا یہ معنی کسی بھی صورت جائز نہیں ہے اور یہ بات بھی جائز بلکہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کا کوئی کلام باطل یا ناممکن اور محال معنی پر مشتمل ہو۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ العقیدۃ الواسطیۃ (ص:۱۱۰) میں فرماتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ کے فرمان:''وھو معکم '' کا یہ معنی نہیں ہے کہ خلق کے ساتھ مختلط ہے۔لغت ''مع '' کے اس معنی کو ہر جگہ ضروری قرار نہیں دیتی۔چاند اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی نشانی ہے، جو آسمان میں رکھی گئی ہے اور وہ ہر مسافر وغیر مسافر کے ساتھ ہے،خواہ وہ کہیں بھی چلے جائیں۔''

یہ معنی باطل ہے، پرانے جہمیہ میں سے صرف فرقہ حلولیہ نے مراد لیا ہے،جن کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے ساتھ ہر جگہ موجود ہے،اللہ تعالیٰ ان کی اس بات سے ،بہت بلند ہے، وہ اپنے منہ سے بہت بڑی اور ناگوار بات کہہ گئے،اور وہ تو ہیں ہی بڑے جھوٹے۔

حلولیہ جہمیہ کا یہ قول ائمہ سلف میں سے جس جس تک پہنچا انہوں نے اس کی شدید نکیر فرمائی، کیونکہ اس مذہب سے بہت سے باطل امور لازم آتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف بہت سے نقائص منسوب کرنے ،اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ علو کا انکار کرنے کو مشتمل ومتضمن ہیں۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر جگہ موجود اور اپنی خلق کے ساتھ مختلط ہے، حالانکہ اس کا فرمان ہے:

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ:(اوراس کی کرسی کی وسعت نے زمین وآسمان کوگھیر رکھا ہے)

نیزفرمایا:﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ﴾

ترجمہ:(ساری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی،اورتمام آسمان اسکے داہنے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے ہونگے)(الزمر:٦٧)

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی''معیت مع الخلق''اس کے''علو علی الخلق''اور''استواء علی العرش''کے منافی یا متناقض نہیں ہے،کیونکہ اللہ تعالیٰ کیلئے مطلقاً علو ثابت ہے،جواللہ تعالیٰ کی ذات اوراسکی صفت(اورمرتبہ ومقام)دونوں کوشامل ہے،جیسا کہ اللہ تعالیٰ کافرمان:﴿وَهُوَ العَلِيُّ الْعَظِيْمُ﴾(البقرۃ:۲۵۵)

ترجمہ:(وہ تو بہت بلنداور بہت بڑا ہے)

نیزفرمایا:﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى﴾(الاعلیٰ:۱)

ترجمہ:(اپنے بہت ہی بلند اللہ کے نام کی پاکیزگی بیان کر)

نیزفرمایا:﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾(النحل:٦٠)

ترجمہ:(اللہ کیلئے تو بہت ہی بلند صفت ہے،وہ بڑا ہی غالب اور باحکمت ہے)

قرآن،حدیث،اجماع،عقل اورفطرت،ان تمام سے اللہ تعالیٰ کے علو(سب سے بلند ہونا) پر بہت سے ادلہ موجود ہیں۔

قرآن وحدیث کے دلائل کا تو شمار ہی ممکن نہیں ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ کافرمان:

﴿فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ﴾(غافر:۱۲)

ترجمہ:(پس اب فیصلہ اللہ بلند وبزرگ ہی کا ہے)

نیز اللہ تعالیٰ کافرمان:﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ﴾(الانعام:٦١)

ترجمہ:(اوروہی اپنے بندوں کے اوپر،غالب ہے برتر ہے)

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ءَ أَمِنتُمْ مَّنْ فِي السَّمَاءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ﴾ (الملک:۱۶)

ترجمہ: (کیا تم اس بات سے بے خوف ہوگئے کہ جو ذات آسمان پر ہے، تمہیں زمین میں دھنسادے)

نیز فرمایا: ﴿ تَعْرُجُ الْمَلَا ئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ﴾ (المعارج:۴)

ترجمہ: (جس کی طرف فرشتے اور روح چڑھتے ہیں)

نیز فرمایا: ﴿قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (النحل:۱۰۲)

ترجمہ: (کہہ دیجئے کہ اسے آپ کے رب کی طرف سے جبرائیل لے کر آئے ہیں)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ألا تأمنونی وأنا أمين من فی السماء]

یعنی (تم مجھے امین کیوں نہیں مانتے، حالانکہ میں اس ذات کا امین ہوں جو آسمان پر ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا [والعرش فوق الماء واللہ فوق العرش] یعنی [عرش پانی کے اوپر ہے اور اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر] (طبرانی کبیر (۲۰۲/۹) شیخ البانی نے صحیح الاسناد کہا ہے)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: [ولا يصعد الى الله الا الطيب]

ترجمہ: [اللہ تعالیٰ تک تو صرف حلال اور پاکیزہ چیزیں چڑھتی ہیں]

اسی طرح عرفہ کے دن جب صحابہ کرام نے یہ اقرار واعتراف کیا کہ آپ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا کر دیا ہے، تو آپ ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا:

[اللهم أشهد] (اے اللہ تو گواہ رہ)

اسی طرح جب آپ ﷺ نے لونڈی سے پوچھا: اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا: آسمان پر، تو آپ ﷺ نے فرمایا: [اعتقها فانها مؤمنة] (اسے آزاد کردو، یہ مؤمنہ ہے۔)

اس معنی کی اور بہت سی احادیث ہیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علو کے اثبات پر اجماع کا تعلق ہے، تو بہت سے اہلِ علم نے اللہ تعالیٰ کے علو پر سلف صالحین کا اجماع نقل کیا ہے۔

جہاں تک دلیلِ عقل کا تعلق ہے، تو عقل اس امر کی متقاضی ہے کہ علو (بلندی) صفتِ کمال اور سفل (پستی) صفتِ نقص ہے، اور اللہ ربّ العزّت ہر صفتِ کمال سے متصف اور ہر صفتِ نقص سے منزّہ ہے۔

جہاں تک دلیلِ فطرت کا تعلق ہے تو ہر دعا کرنے والا جب اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے تو اس کے دل سے جہتِ علو کی طرف متوجہ ہونے کی آواز اٹھتی ہے، حالانکہ یہ بات اس نے نہ کسی کتاب میں پڑھی، نہ کسی معلّم سے سیکھی ہوتی ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے اتنے قطعی دلائل کے ساتھ جو علو ثابت ہے، وہ معیت مع الخلق کی حقیقت کے مناقض یا معارض نہیں ہے، اور اسکی کئی وجوہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدس میں اپنے متعلق خود ان دونوں حقیقتوں کو جمع فرمادیا ہے، جبکہ قرآنِ حکیم ہر تناقض سے پاک ہے، اور اگر ان دونوں صفات کی حقیقت میں کوئی تعارض یا تناقض ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہرگز قرآن میں جمع نہ فرماتا۔ اور اگر قرآن مجید میں بظاہر کہیں آپ کو تعارض محسوس ہو رہا ہو تو وہاں بار بار تفکر اور تدبر کرو، حتی کہ تعارض رفع ہو کر مسئلہ واضح ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾

ترجمہ: (یہ لوگ قرآن پر تدبر کیوں نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے آیا ہوتا تو لوگ اس میں بڑا اختلاف اور تناقض پاتے) (النساء:۸۲)

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ معیت اور علو دونوں حقیقتوں کا ایک مخلوق کی ذات میں جمع ہونا ممکن ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "مازلنا نسیر والقمر معنا" (ہم چلتے رہے اور چاند

ہمارے ساتھ تھا) حالانکہ یہ بات معلوم ہے کہ چلنے والے تو زمین پر چل رہے ہیں اور چاند آسمان پر ہے، جب یہ بات ایک چھوٹی سی مخلوق کے بارہ میں ممکن ہے، تو وہ خالق جو ہر شئی کا احاطہ کرنے والا ہے کے بارہ میں کیا خیال ہے؟

شیخ محمد خلیل ہراس نے شرح العقیدۃ الواسطیۃ میں شیخ الاسلام کی ذکر کردہ اس مثال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

'' شیخ الاسلام نے چاند کی مثال بیان فرمائی ہے جو آسمان پر ہے، اور جو مسافر کے ساتھ ساتھ بھی ہوتا ہے، خواہ وہ کہیں بھی پہنچ جائے، تو جب علو اور معیت کا چاند کے حق میں جمع ہونا ممکن ہے، حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک چھوٹی سی مخلوق ہے، تو اس پروردگار کے حق میں ممکن نہیں؟ جو لطیف وخبیر ہے، جو اپنے تمام بندوں کا علماً وقدرۃً احاطہ کیئے ہوئے ہے، جو ان پر گواہ ہے، اور اپنے سمع وبصر سے ان کے ہر امر پر مطلع ہے، جو ان کے خفیہ بھیدوں اور سرگوشیوں تک کو جانتا ہے، بلکہ آسمانوں اور زمینوں سمیت پورا عالم، اور عرش سے فرش تک ہر چیز اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہے جیسے ہم میں سے کسی کے ہاتھ میں چھوٹی سی گولی ہوتی ہے۔

تو جس پروردگار کی یہ شان ہے اس کیلئے کیا یہ بات ناممکن ہے کہ وہ مخلوق سے بلند اور اپنے عرش پر ان سے جدا ہونے کے باوجود ان کے ساتھ ساتھ ہو؟

(۳) اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ علو اور معیت کا بحقِ مخلوق جمع ہونا ممکن نہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ بحقِ خالق بھی ان کا جمع ہونا ناممکن ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مشابہ یا مماثل نہیں ہے: ﴿لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ وَھُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ﴾ (الشوریٰ:۱۱)

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''العقیدۃ الواسطیۃ'' (ص:۱۱۶) میں فرماتے ہیں:

'' اللہ تعالیٰ نے جو قرآن وحدیث میں اپنے بندوں کے ساتھ اپنے قرب اور معیت کا ذکر فرمایا

ہے، یہ اس کے علو اور فوقیت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ تمام صفات میں اللہ تعالیٰ جیسا کوئی نہیں، وہ قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند بھی ہے، اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ قریب بھی ہے''

ہماری اس بحث کا خلاصہ یہ ہے:

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق قرآن، حدیث اور اجماع سلف سے ثابت ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت حق ہے اور اپنی اُس حقیقت پر قائم ہے جو اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان ہے، اور اللہ تعالیٰ کی معیت ایسی نہیں جیسی ایک مخلوق کی دوسری مخلوق کے ساتھ ہوتی ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی معیت مع الخلق اس امر کی متقاضی ہے کہ وہ از روئے علم، قدرت، سمع، بصر، غلبہ، تدبیر اور دیگر معانی ربوبیت کے ساتھ اپنی تمام مخلوق کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ اور معیت کا یہ معنی تب ہوگا جب معیت سے مراد معیتِ عامہ ہوگی، اور اگر معیتِ خاصہ کا ذکر ہوگا تو پھر علم واحاطہ کے ساتھ ساتھ معیت کا معنی نصرت، تائید، توفیق اور تسدید (سیدھا کرنا) ہوگا۔

☆ صفتِ معیت ہرگز اس امر کو متقاضی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی خلق میں مختلط یا حلول کیئے ہوئے ہے، معیت کا یہ معنی کسی صورت نہیں بنتا۔

☆ ان تمام باتوں پر تدبر کرنے سے یہ بات واضح اور ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی خلق کے ساتھ ہونا ایک حقیقت ہے، اور اس کا آسمانوں کے اوپر اپنے عرش پر مستوی ہونا بھی ایک حقیقت ہے، اور ان دونوں حقیقتوں میں کوئی منافات یا تعارض نہیں ہے۔ سبحانہ وبحمده لانحصي ثناء عليه هو كما أثنى على نفسه، وصلى الله على عبده ورسوله محمد وآله وصحبه اجمعين

محمد الصالح العثيمين

۱۴۰۳ھ